مدیر: طاہر ایس ملک
نائب مدیر: سعید نامدار معاونین: سعید مختار، حاتم بھٹی
سرکولیشن: محمد آصف جنید قانونی مشیر: شمیم احمد، شیخ مطلوب احمد
تزئین: عبدالوحید شیخ آرٹسٹ: عنید

برائے خط و کتابت و کام اشاعت: اشتیاق پبلی کیشنز ۹ تیسرا آباد ساندہ کلاں لاہور ۲۲۱۵۲۷

ماہنامہ
چاند ستارے
لاہور

اس ماہ کا خاص ناولٹ
سیاہ درخت
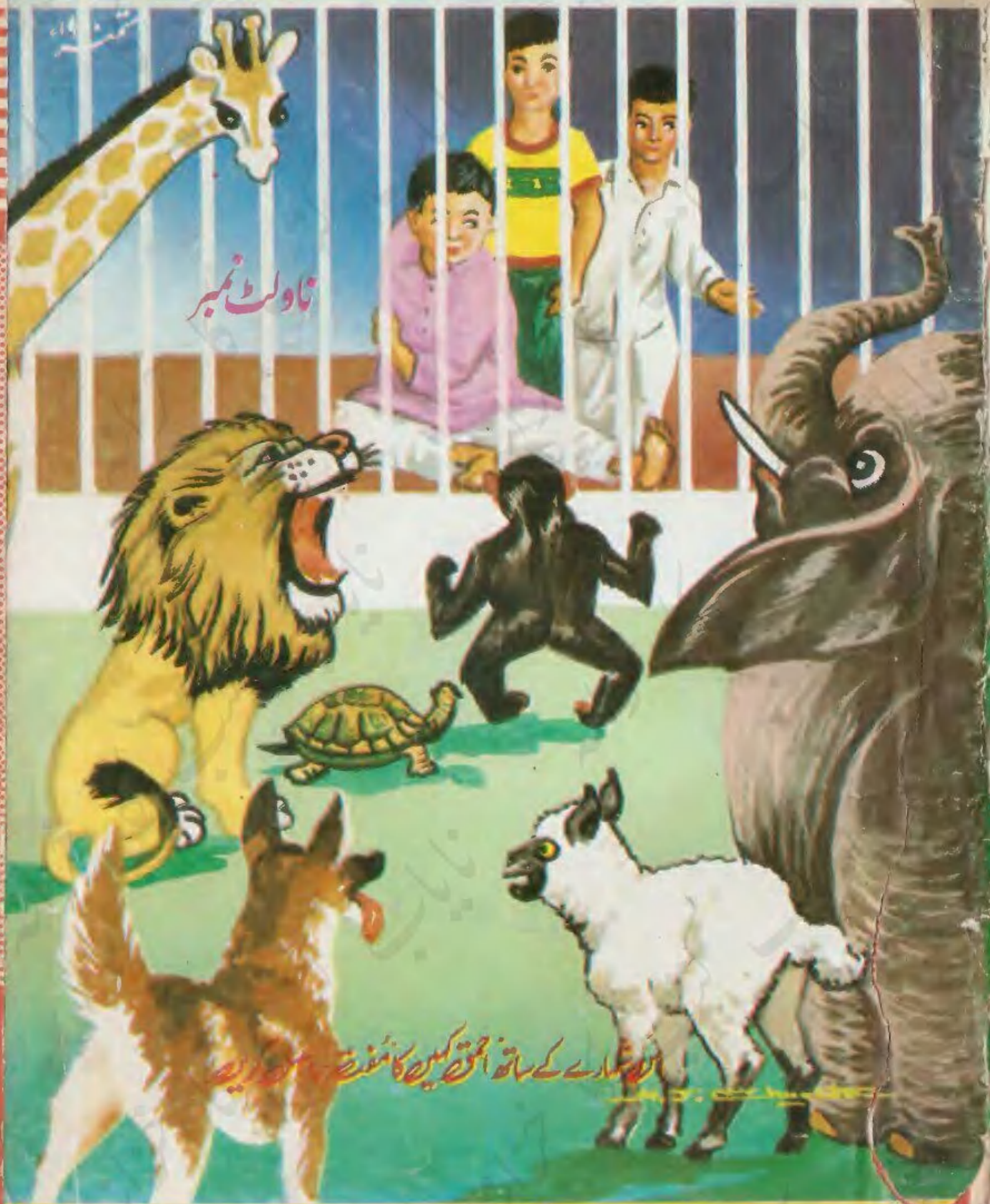
ناولٹ نمبر

اس شمارے کے ساتھ احمق کمپین کا مفت ...

617

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایک آیت ایک حدیث

محمد الیاس بالاکوٹی

آیت : وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○

ترجمہ : اور وہ لوگ جو خوشحالی اور تنگدستی ہر حال میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور غُصّہ پی جاتے اور لوگوں سے عفو و درگذر کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے محسنوں کو محبوب رکھتے ہیں ـــــ

حدیث : عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنْہُ اَنَّ اَبَا بَکْرٍ تَضَیَّفَ رَھْطًا فَقَالَ لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ دُوْنَکَ اَضْیَافَکَ فَاِنِّیْ مُنْطَلِقٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّمَ فَافْرُغْ مِنْ قِرَاھُمْ قَبْلَ اَنْ اَجِیْءَ فَانْطَلَقَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ فَاَتَاھُمْ بِمَا عِنْدَہٗ فَقَالَ اَطْعِمُوْا فَقَالُوْا اَیْنَ رَبُّ مَنْزِلِنَا قَالَ اَطْعِمُوْا قَالُوْا مَا نَحْنُ بِاٰکِلِیْنَ حَتّٰی یَجِیْءَ رَبُّ مَنْزِلِنَا .... (بخاری شریف)

ترجمہ : سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہٗ سے منقول ہے کہ والد ماجد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ نے کچھ لوگوں کی دعوت کی اور مُجھے کہا کہ انھیں گھر لے جاؤ اور ان کے پاس رہنا اور ان کی مہمانی میں کوئی کوتاہی نہ کرنا ، میں نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں جا رہا ہوں ، شاید مجھے دیر ہو جائے ، تم انھیں کھلا پلا دینا۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہتے ہیں کہ انھیں میں لے آیا اور جو بن سکا ، کھانا دانا حاضر کر دیا اور کہا کہ کھائیں۔ وہ کہنے لگے ، صاحبِ خانہ کہاں ہیں ؟ میں نے کہا ، وہ موجود نہیں ، آپ حضرات کھانا کھالیں۔ وہ کہنے لگے ، ہم صاحبِ خانہ کے آنے سے پہلے کھانا نہیں کھائیں گے ، ہم تو ان کے ساتھ کھائیں گے۔ میں نے بہت منت سماجت کی کہ وُہ دیر سے آئیں گے اور آپ حضرات نے کھانا نہ کھایا ہوا ہوگا تو مجھ پر ناراض ہوں گے ، مگر وُہ بضد رہے۔ میں بڑا فکر مند ہوا ـــ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ دیر سے گھر آئے تو اہلیہ نے کہا ، تم مہمان چھوڑ کر کہاں دیر کر آئے ، وہ بھوکے بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ نے مہمانوں سے حال

احوال پُوچھا، معلوم ہوا ابھی تک بھوکے بیٹھے ہیں۔ میں مارے ڈر کے مکان کے کونے میں چھپ گیا۔ انھوں نے مجھے پکارا، یا عبدالرحمٰن ۔ میں دُبکا رہا اور نہ بولا ۔ بار بار پکارنے پر فرمایا ۔ او ناک کٹے ، تجھے میں قسم دیتا ہوں ، اگر میری آواز سُن رہے ہو تو باہر آؤ ۔ میں حاضر ہو گیا اور عرض کی ، ابّا جی ! پہلے اپنے مہمانوں سے پُوچھ لیں کہ ماجرا کیا ہے۔ وُہ خود ہی بول اُٹھے اس کی کوتاہی نہیں ، ہم نے آپ کے بغیر کھانا قبول نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ نے برہم ہو کر کہا کہ رات گئے تک میرے انتظار میں بیٹھے رہنا اور اہلِ خانہ کو بھی پابند رکھنا کوئی تُک ہے ، میں اس رات گئے کھانا نہیں کھاؤں گا ۔ انھوں نے کہا ، پھر ہم بھی آپ کے سوا نہیں کھائیں گے ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ نے قسم اٹھالی ، میں نہیں کھاؤں گا۔ اس پر انھوں نے بھی قسم اُٹھالی کہ ہم آپ کے بغیر نہیں کھائیں گے ۔ میں بڑا سٹپٹایا کہ ہمارے گھر میں یہ کیسا شر آگھسا، ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔ دونوں طرف سے قسمیں، اب کیا بنے گا ۔

توقف کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے کہا ، تم نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا ، لاؤ کھانا ۔ تب کھانا لایا گیا ۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ نے کہا ، بسم اللہ ..... پہلی حرکت شیطانی ہے ، ہم اس پر نہیں چلیں گے ۔ اور کھانے کا لقمہ لے لیا ۔ اس پر مہمان کھانا کھانے لگے ۔ اللہ تعالیٰ کی شان ، ہم سب کھا رہے ہیں اور کھانا نیچے سے اور اُگتا جاتا ہے اور بڑھتا ہے ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ متعجب ہو کر پکار اٹھے : یا اُمِّ فراس (اہلیہ سے) یہ اللہ تعالیٰ کی برکت دیکھو ۔ وہ کہنے لگیں ، یہاں بھی یہی ہو رہا ہے ۔ چنانچہ سب اہلِ خانہ نے سیر ہو کر کھایا اور صبح کو نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے اسی سے لے کر گئے ۔

نادل اور چاند ستارے منگوانے کے لیے آپ اگر ڈاک ٹکٹ ارسال کرتے ہیں تو رجسٹرڈ لفافے میں ارسال کریں ۔ بصورتِ دیگر ادارہ ذمّے دار نہیں ہوگا ــــــــــ (ادارہ)

گولی کھا لوں گا

دو باتیں

السلامُ علیکم !

ایک ہندو فوجی افسر نے اپنے دستے میں شامل ایک مُسلمان کو سری نگر کے علاقے میں بجلی کے کھمبے پر لگا ایک جھنڈا اُتارنے کا حُکم دیا۔ حُکم سُن کر مُسلمان فوجی کھمبے پر چڑھ گیا ۔ جھنڈے پر کلمہ طیبّہ لکھا ہوا تھا۔ مُسلمان فوجی جھنڈا اُتار لایا تو فوجی افسر نے حُکم دیا ، وُہ اس سے اپنے جُوتے صاف کرے ۔ سپاہی نے کہا ، جھنڈے پر کلمہ طیبّہ لکھا ہوا ہے ، وُہ اس سے جُوتے صاف نہیں کر سکتا ۔ یہ سُن کر بھارتی فوجی افسر کو غُصّہ آ گیا ۔ اس نے کہا ، اس جھنڈے سے جُوتے صاف کرو ، ورنہ حُکم عدولی کی سزا کے طور پر تمھیں گولی مار دی جائے گی ۔ مُسلمان سپاہی نے دلیر ہو کر جواب دیا ، گولی کھا لوں گا ، اس جھنڈے سے جُوتے صاف نہیں کروں گا ۔

اس پر افسر نے بھارتی سپاہیوں کو حُکم دیا کہ وُہ اسے گولی مار دیں ۔ انھوں نے رائفلیں تان لیں ۔ اس موقعے پر بھی مسلمان نہ ڈگمگایا، چٹان کی طرح کھڑا رہا اور اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا ۔

یہ ایمان افروز واقعہ پڑھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا ۔ میرا جی چاہا، مَیں پُکار پُکار کر کہوں ۔ راکھ کے بڑے ڈھیر میں ابھی کچھ چنگاریاں باقی ہیں ۔ اور یہ چنگاریاں اِن شاءاللہ ایک دن راکھ کو اُڑا کر رکھ دیں گی۔ آپ بھی کہیے ، اِن شاءاللہ !

حمد

ہر جگہ دیکھا گیا اور خو بخو دیکھا گیا
میرے مالک میرے آقا تُو ہی تُو دیکھا گیا

کس قدر اونچا وارفع ہے تِرا دیدار بھی
کہ وہاں جبرئیل بھی کچھ گو مگو دیکھا گیا

میرے دل میں میری جاں میں میرے روئے قلب میں
اے میرے مالک! تُو حسبِ آرزو دیکھا گیا

اس جہاں میں تو شۂ کون و مکاں کے واسطے
مجھ سا بندہ کر رہا ہے جستجو دیکھا گیا

زینؔ دُنیا میں خُدا کی آج کل رہتا ہے تو
پھر وجہ کیا ہے کہ تو بھی بے وضو دیکھا گیا

زینؔ

نعت

مری زباں پہ جب محمدؐ کا نام ہوتا ہے
خدا کے فضل کا تب اِہتمام ہوتا ہے

ملک تلاش میں رہتے ہیں ان مجالس کی
جہاں نبیؐ پر درود و سلام ہوتا ہے

چراغِ عشقِ محمدؐ جلاؤ سینوں میں
بغیر عشق کے جینا حرام ہوتا ہے

جسے حدیثِ رسولِ کریمؐ کہتے ہیں
بعینہٖ وُہ خُدا کا کلام ہوتا ہے

درودِ پاک ہی آزادؔ وُہ وظیفہ ہے
خطا کا جس سے تصوّر تمام ہوتا ہے

حافظ بشیر آزادؔ

چند باتیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی

ندیم الحسن گیلانی

آپؐ بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے، انھیں پہلے سلام کرتے، بعد میں پیار کرتے، بوڑھوں کی پوری عزت فرماتے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہٗ اپنے بوڑھے اور نابینا باپ کو بیعت کے لیے لائے تو فرمایا:
"تم نے انھیں کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔"

ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کنوئیں پر غسل کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک صحابیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پشت کر کے چادر تان کر کھڑے رہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے اور صحابیؓ

کے نہانے کی باری آئی تو آپؐ بھی اسی طرح چادر تان کر کھڑے ہو گئے اور پردہ کیے رہے۔ صحابیؓ کو اپنے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ تکلیف کیونکر گوارا ہو سکتی تھی، التجا کی:

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری جان آپ پر قربان، آپ یہ تکلیف نہ فرمائیں۔ ارشاد ہوا:

"جیسا میں انسان ہوں، ویسے ہی تم ہو، مجھے ایسی کب فوقیت حاصل ہے؟"

ایک سفر کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منزل پر قیام فرمایا۔ کھانا پکانے کا انتظام ہونے لگا، بکری کو ذبح کرنے کی تیاری ہونے لگی۔ صحابہ کرام میں سے ہر شخص نے ایک ایک کام اپنے اپنے ذمے لیا۔ ایک نے بکری ذبح کرنے پر آمادگی ظاہر کی، دوسرے نے...... اس کے بنانے اور صاف کرنے کی خواہش کی، تیسرے نے کہا کہ میں پکاؤں گا۔ چوتھے صحابی بولنے لگے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔"

صحابہ کرام نے عرض کیا:

"ہماری جانیں آپؐ پر قربان، ہمارے ہوتے آپ کو کسی کام کے کرنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگوں کی میرے حال پر بڑی عنایت ہے، لیکن مجھے منظور نہیں کہ تم سے بڑا بن کر بیٹھ جاؤں۔ ساتھی وہ ہے جو ساتھیوں کے کام کاج میں شریک ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کام کاج کرو اور میں بیٹھا منہ دیکھا کروں، مجھے ساتھی ہونے کا حق ادا کرنے دو۔"

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگل سے لکڑیاں جمع کر کے لائے، آپ ہمیشہ ایسے موقعوں پر کام کاج میں برابر کے شریک رہتے تھے۔

مسجدِ نبوی کی تعمیر ہوئی تو آپ بھی مزدوروں کی صف میں شامل ہو گئے۔ مٹی کھودتے تھے، ڈھوتے تھے، اس قدر بھاری پتھر اٹھاتے کہ جسم مبارک لچک جاتا۔ عقیدت مند عرض کرتے، ہمارے ماں باپ فدا ہوں، آپ چھوڑ دیں، ہم خود اٹھا لے جائیں گے۔ فرماتے، بہت اچھا۔ لیکن ذرا دیر بعد پھر اتنا ہی بڑا پتھر اٹھاتے اور کام کرنے والوں کی صف میں شامل ہو جاتے۔ جب مزدور تھکن دور کرنے کے لیے کچھ اشعار وغیرہ پڑھتے تو آپ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے۔

سعید مختار

میں کیسے بنا ہوں؟

یہ جو ہمارا نظامِ شمسی ہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ یہ کیسے بنا ہے؟ کیوں بنا ہے؟ ہم آج آپ کو اس کے بننے کی کہانی نظامِ شمسی کی اپنی زبانی سناتے ہیں۔ تو سُنیے:

میں ہوں نظامِ شمسی۔ میرے ایک سیارے پر آپ رہتے ہیں۔ مجھے آج آپ کو ایک کہانی سنانے کے لیے بلایا گیا ہے۔ یہ کہانی میرے بننے کی ہے۔

میں خود آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا، میں تو صرف وہ باتیں سناؤں گا جو کہ آپ میں سے کچھ ذہین لوگوں نے میرے بننے کے بارے میں جانی ہیں۔

میرے بارے میں تو لوگ بہت عرصے سے سوچتے آرہے تھے، مگر کوئی ٹھوس نظریہ سب سے پہلے ۱۷۹۶ء میں ایک فلکیات دان LAPLACE نے دیا۔ اس نے کہا کہ میں گیس اور دھول کے ایک بادل سے بنا ہوں، جسے NEBULA کہتے ہیں۔ یہ NEBULA بھی آپ کے ہاں بولی جانے والی زبان لاطینی کا ایک لفظ ہے، جس کا مطلب ہے بادل۔

اس بادل میں برف کے رنگ کا سفید مادہ تھا جو کہ اپنی کشش کی وجہ سے اپنے گرد چکر لگاتا رہتا تھا اور آہستہ آہستہ اپنی گھومنے کی رفتار تیز کرتا رہتا تھا۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ اس کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ اس میں سے مادے کے کچھ ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر اس سے دور جانے لگے۔ اور دور جا کر سخت ہو گئے اور سیارے بن گئے۔ اور جو مادہ اس بادل میں رہ گیا وہ سورج بن گیا۔

آپ کے اس سائنس دان نے یہ بھی کہا کہ جو سیارہ سب سے دور ہو گا، وہ سب سے پرانا ہو گا اور زیادہ عمر کا ہو گا۔ اور اسی طرح سورج کے سب سے نزدیک سیارہ سب سے کم عمر کا ہو گا۔ اور سورج کی عمر سب سے کم ہو گی۔

میں یہ سن کر مسکرایا تھا، مگر میں نے اس سائنس دان کی ذہانت کی داد ضرور دی تھی۔ اس کے دور میں یہ نظریہ بہت مشہور ہوا تھا، مگر بعد کے سائنس دانوں کو میں نے یہ کہتے سنا کہ اس نظریے میں کچھ فنی خرابیاں ہیں۔

آخر ۱۹۰۰ء میں ایک ماہر ارضیات (CHUMBERLIN) نے ایک اور نظریہ دیا۔ یہ تھا کہ جب میں بادل کی شکل میں تھا تو میرے ساتھ کوئی ستارہ ٹکرایا اور مجھ سے مادے کے ٹکڑے نکل کر بکھر گئے اور سیارے بن گئے۔

اس طرح سارے سیارے ایک عمر کے ہوئے۔ مجھے یہ نظریہ بھی بہت دلچسپ لگا، مگر کچھ سائنس دانوں نے یہ کہا کہ یہ غلط ہے۔ اگر میں اس طرح بنا ہوتا تو کوئی سیارہ نہ بن پاتا، کیونکہ بادل میں گرمی اتنی زیادہ تھی کہ سیارے گیس کی شکل سے آگے نہ آ پاتے۔

اور پھر میں نے جرمنی میں ایک فلکیات دان کو دیکھا۔ وہ بھی مجھ پر تحقیق کر رہا تھا۔ اور آخر اس نے ۱۹۴۴ء میں تمام خامیاں دور کر کے LAPLACE والے نظریے کو آگے بڑھایا۔ اس

کے مطابق اگرچہ میں بادل (NEBULA) سے بنا ہوں، مگر میرے سارے سیارے اور سورج ایک ہی عمر کے ہیں۔

اور یہی نظریہ آج تک آپ لوگ مانتے ہیں کہ میں بادل کی تیز گردش سے بنا ہوں۔

جرمنی کے اس فلکیات دان جس کا نام WERSACKER تھا، نے میرے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا کہ جب میرے سیارے بنے تو بادلوں کی دھول اکٹھی ہو کر پہلے چھوٹے پتھروں اور پھر پہاڑوں میں بدل گئی۔ کچھ ٹیلے بن گئے۔ اس وقت کچھ مادہ فضا میں بھی چلا گیا۔ اپنے پیچھے گڑھے چھوڑ دیے، جنھیں ہم آج CRATERS کہتے ہیں۔ یہ دوسرے سیاروں پر تو بہت زیادہ ہیں، مگر زمین پر جاندار چیزوں اور ہوا نے ان کے نشانات مٹا دیے ہیں۔ ان CRATERS کو آپ لوگ میرے بننے کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اسی حساب سے آپ نے میری عمر بھی بتائی ہے۔

آپ کے خیال میں میں چار ارب ساٹھ لاکھ سال پہلے سیاروں کی شکل میں بنا۔ میرے بننے کے بعد اس زمین پر پانچ کروڑ سال تک بڑے بڑے پتھر برستے رہے اور پھر تقریباً چار ارب سال پہلے میرے سب سے چہیتے سیارے زمین پر خاموشی چھا گئی، پھر تین ارب پچاس لاکھ سال پہلے اس زمین پر حیات شروع ہوئی۔

یہی کچھ ہے جو آپ نے میرے بارے میں معلوم کیا ہے، مگر یہاں میں آپ کو اور بھی کچھ بتانا چاہتا ہوں۔

میں جس کہکشاں میں رہتا ہوں، اسے آپ لوگ ملکی وے (MILKY WAY) کہتے ہیں۔ آپ نے اس کا نام ایک دیوی کے بکھرے دودھ سے منسوب کیا ہے، مگر میں اس کہکشاں کو اپنا گھر کہتا ہوں۔

آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کہکشاں بھی ایک بہت بڑے بادل سے بنی ہے اور اسی طرح دوسری کہکشائیں بھی۔ اور اب تو آپ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک سو ارب کہکشائیں ہیں۔ اور ہر کہکشاں میں تین سو ارب ستارے ہیں۔

اور آپ نے تو یہ بھی جانا ہے کہ یہ کائنات اور اس میں موجود کہکشائیں آج سے دس سے

پندرہ ارب سال پہلے وجود میں آئیں۔ اور یہ مختلف شکل کی ہیں۔ کچھ گول اور کچھ تھالی کی شکل کی۔ اور کچھ بازوؤں والی۔ وُہ کہکشاں جس میں مَیں رہتا ہُوں، یعنی میرا گھر بازوؤں والا ہے۔ اس کے بازوؤں کے ایک کونے میں مَیں رہتا ہوں اور یہیں مُجھ میں آپ رہتے ہیں۔

کہیے اب تو پتا چل گیا کہ میں کیسے بنا ہوں۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اپنے بارے میں خود کچھ نہیں بتایا، بس وہ کہانی دہرائی ہے جو آپ خود معلوم کر چکے ہیں۔ آپ بہت بے چین ہیں کہ مَیں خود اپنے بارے میں کیا کہتا ہوں کہ میں کیسے بنا، کیونکہ جب میں بنا تو آپ نہیں تھے، لیکن مجھے تو معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اور یہی آپ جاننا چاہتے ہیں، یعنی میرے بننے کا آنکھوں دیکھا حال۔ مگر میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ناراض ہو گئے بھئی دیکھیں، ایسے ٹھیک نہیں۔ آپ کی ناراضی کا میرے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ کیونکہ میں مجبور ہوں۔ بتانا بھی چاہوں تو نہیں بتا سکتا۔ یہ سب قدرت کے راز ہیں، وُہ خود جن پر سے پردہ اٹھانا چاہتا ہے، اٹھا دیتا ہے۔ اور آپ خود ہی وہ جان لیتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ میں ابھی بے شمار راز چھپے ہوتے ہیں جو آپ کو نہیں معلوم۔ اور ہو سکتا ہے کہ اکثر آپ کو کبھی بھی معلوم نہ ہو سکیں۔ میں خود کچھ نہیں کر سکتا، مگر ایک بات کہنے کی مجھے اجازت ہے اور وہ میں ضرور کہوں گا اور میرے خیال میں وہ آپ کے لیے کافی ہوگی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ وہی آپ کا بھی خالق ہے اور آپ کو تو اس خالق کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جس نے آپ کو اشرف المخلوقات بنایا۔ میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، پھر بھی میرا یہ حصّہ یعنی سورج غروب ہونے کے فوراً بعد عرش پر سجدہ کرتا ہے اور اپنے خالق سے دوبارہ نکلنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ مجھے فنا ہونا ہے، آپ کو نہیں۔ لہٰذا اس کے احکام مانیں جس نے اس کائنات کی ہر چیز کو بنایا ہے۔

منان علی قریشی کی کہانی "خوفناک ہاتھی" نقل شدہ ثابت ہوئی ہے۔ اسے بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔ آیندہ چھے ماہ تک اس کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوگی۔ (مدیر)

- آپ کو ادارہ اشتیاق پبلی کیشنز کے ناول حاصل کرنے میں کسی قسم کی دشواری ہوتی ہے۔
- یا آپ شہر سے دُور رہتے ہیں، یا ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں اشتیاق احمد کے ناول نہیں پہنچتے۔
- یا آپ اپنے شہر کے بُک سٹال تک نہیں جا سکتے۔ یا آپ پردہ نشین خواتین ہیں اور بازار نہیں جاتیں۔
- یا آپ کی کاروباری مصروفیات یا سکول اور کالج کی مصروفیات اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ بُک سٹال تک جائیں۔
- ایسی کوئی بھی صورت ہے اور آپ ادارہ اشتیاق پبلی کیشنز کی کتب پڑھنا بھی چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل سکیم سے فائدہ اٹھائیں:
- ادارے نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ایسے پریشان قارئین کو گھر بیٹھے کتب مہیا کی جائیں گی۔
- اس طرح کہ ڈاک خرچ اور کوئی دُوسرا خرچ ان کے ذمّے نہیں پڑے گا۔ کتب بحفاظت اُن تک پہنچیں گی۔
- کتب گم ہونے یا کسی وجہ سے نہ پہنچنے کی صُورت میں بھی ادارہ ذمّے دار ہوگا اور ہر حالت میں کتب خریداروں کو پُہنچائے گا۔
- اب سوال یہ ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟
- اگر آپ اشتیاق احمد کا مِنی خاص نمبر قیمت ۱۷/۰۰ روپے، آفتاب کا ناول قیمت ۱۶/۰۰ روپے اور چاند ستارے قیمت ۹/۰۰ روپے ہر ماہ تینوں منگوانا چاہتے ہیں تو ہر ماہ پہلی تاریخ کے آس پاس مبلغ ۴۲/۰۰ روپے، اگر آپ اشتیاق احمد اور آفتاب احمد کے دو ناول ہر ماہ چاہتے ہیں تو ۳۳/۰۰ روپے، اگر آپ صِرف اشتیاق احمد کا ناول ہر ماہ چاہتے ہیں تو ۱۷/۰۰ روپے، اگر آپ آفتاب احمد کا ناول اور چاند ستارے ہر ماہ چاہتے ہیں تو ۲۵/۰۰ روپے اور اگر آپ اشتیاق احمد کا ناول اور چاند ستارے ہر ماہ چاہتے ہیں تو ۲۶/۰۰ روپے کا منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا ڈرافٹ ارسال کریں۔
- اگر آپ سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں تو تینوں کتابوں کے لیے ۵۵۶/۰۰ روپے، ایک ناول + چاند ستارے کے لیے ۳۳۲/۰۰ روپے اور ایک ناول کے لیے ۲۲۴/۰۰ روپے کا منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا ڈرافٹ ارسال کریں۔

نیز ان کے ساتھ پُرانی کتب بھی منگوانا چاہیں تو ۸/۰۰ روپے تک والی کتابوں کے لیے ۴/۰۰ روپے فی کتاب کا اضافہ کرتے چلے جائیں۔۔۔ اور ان ناولوں کے نام ساتھ لکھ دیں ـــــ شکریہ!

چاند ستارے انعامی سلسلہ نمبر ۲۰ کا انعام

500

روپے کے نقد انعامات کا اعلان

جون ۹۰ء کے چاند ستارے میں ایک بلاعنوان کہانی کا خوبصورت اور مناسب سا عنوان تجویز کرنے کو کہا گیا تھا ۔ اس سلسلے میں موصول ہونے والے عنوانات میں سے مندرجہ ذیل دس عنوانات بہترین قرار پائے ۔ انعام یافتگان کو پچاس پچاس روپے فی کس نقد انعام روانہ کیا جا رہا ہے ——— (ادارہ)

انعام یافتگان اور اُن کے تجویز کردہ عنوانات

(۱) مستقبل کے معمار ——— مقبول احمد اختر، مکان ۲۴/۴ای، نور احمد سٹریٹ، میانوالی
(۲) آزادی خون مانگتی ہے ——— زاہد اقبال، ۸۰۶ بی پیپلز کالونی نمبر۲، صدیقیہ چوک، فیصل آباد
(۳) نئی صبح کی نوید ——— نابغہ ناز، اقبال نگر، فیصل آباد
(۴) کشمیر کو بچالو ——— جواد ظفر عثمان، حبیب الیکٹرک سروس، ریلوے روڈ، خانیوال
(۵) گریں گی یہ دیواریں ——— عرفان عنایت، بمقام وڈاکخانہ کوٹلی نوناں، تحصیل ڈسکہ، ضلع سیالکوٹ
(۶) آزادی اور کفن ——— پرنس ندیم اختر، گلی شارع جنیدی، مبارک پورہ، سیالکوٹ
(۷) درسِ اخوت ——— محمد سعید اختر، ملک محمد صدیق مٹھائی شاپ، محلہ پنڈی، جھنگ صدر
(۸) پہاڑوں کا قبرستان ——— ساجد محمود، لونگو والی گلی نزد گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول لالہ موسیٰ
(۹) ایک ہی مقصد ——— عنبرین گلزار علی، الفرنڈ اسٹریٹ، گارڈن ویسٹ، کراچی
(۱۰) آج کے بچے کل کے مجاہد ——— عاصم اسد فرہاد، مکان نمبر۶، گلی نمبر۱، تیزاب احاطہ، لاہور

عبدالقادر احمد، نوآباد، کراچی کو بہترین لطیفے پر ایک آٹو گراف بُک بطور انعام دی جائے گی۔

عاطف : (عزیز سے) میرے ابّو اتنے بہادر ہیں، جتنا شیر۔ اتنے طاقتور ہیں، جتنا گینڈا۔ اتنے اونچے ہیں، جتنا زرافہ ۔ اتنے تیز رفتار ہیں، جتنا چیتا۔ ان کی نظر اتنی تیز ہے، جتنی عقاب کی اور اتنے چالاک ہیں، جتنی لومڑی ۔

عزیز: وہ کس چڑیا گھر میں ہیں؟"

(عبدالقادر احمد، نوآباد، کراچی)

ایک مداری تماشہ دکھا رہا تھا، اس نے ہجوم میں سے ایک لڑکے کو بلایا اور پوچھا: "لڑکے، بتاؤ تم میرے رشتے دار تو نہیں ہو؟"

لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا: "نہیں ابّا جان!"

(محمد اشرف اعوان، جوکھیاں، وزیرآباد)

بیوی: (شوہر سے) سُنا ہے، آپ کے فلسفی دوست سمندر میں ڈوب کر مر گئے ۔

شوہر: ہاں! انھیں ہر چیز کی گہرائی میں جانے کا شوق تھا ۔

(فاروق علی، شیخ ہاؤسنگ سوسائٹی، فیصل آباد)

ایک بے وقوف شخص نوکری کے لیے انٹرویو دینے گیا، دروازے پر چوکیدار نے کہا: "ہمارا صاحب تین سوال کرے گا، آپ کی عمر کتنی ہے؟ تم جواب دینا ۳۶ سال، پھر پوچھے گا، تمھارا تجربہ کتنا ہے؟ تم کہنا ۱۵ سال، پھر پوچھے گا، اردو آتی یا انگلش؟ تم جواب دینا، دونوں ۔

جب وہ بے وقوف شخص اندر گیا تو صاحب نے اس شخص سے پوچھا: "تمھارا تجربہ کتنا ہے؟" اس شخص نے جواب دیا: "۳۶ سال"۔ صاحب نے پھر پوچھا: "تمھاری عمر کتنی ہے؟" اس شخص نے جواب دیا: "جناب ۱۵ سال"۔ صاحب نے غصّے سے کہا: "تم پاگل ہو یا میں؟" بے وقوف نے

اطمینان سے جواب دیا: "دونوں"۔
(جاوید الرحمٰن، رستم پارک، ملتان روڈ، لاہور)

دو دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی بات پر ایک نے دوسرے سے کہا: "تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔" قریب سے ایک آدمی گزر رہا تھا، اس نے صرف پالا کا لفظ سنا تو کہنے لگا: "پالا کہاں، یہاں تو گرمی پڑ رہی ہے۔"
(روبینہ عزیز، سمن آباد، لاہور)

ایک صاحب راستے میں چلتے ہوئے کنویں میں گر پڑے اور چیخنے چلانے لگے۔ ایک خاتون کا وہاں سے گزر ہوا۔ کنویں میں جھانکا، تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور یوں گویا ہوئیں: "کیا تم خود اس کنویں میں گرے ہو؟"
وہ صاحب ضبط نہ کر سکے اور جھنجلا کر بولے: "جی نہیں محترمہ! میں تو یہاں کھڑا تھا، وہ تو لوگوں نے میرے اردگرد دیواریں بنا دیں۔"
(صائمہ ارم، لالہ رخ، واہ کینٹ)

ایک کلرک چھٹی کی درخواست لیے جیسے ہی اپنے افسر کے کمرے میں پہنچا تو افسر اس کی شکل دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ چھٹی کی درخواست لایا ہے۔ افسر غصے سے بولا: "اب تم نے کیا بہانہ بنایا ہے؟ بیوی کو الوداع کہنے، بچی کے خسرہ نکلنے، بچے کو سکول میں داخل کروانے اور ساس کے جنازے میں شرکت کرنے کے بہانوں سے تم پہلے ہی بہت چھٹیاں لے چکے ہو۔"
"سر! اب میں شادی کر رہا ہوں۔" کلرک نے سر جھکا کر جواب دیا۔
(صوبیدار منیر حسین، سی ایم ایچ، جہلم کینٹ)

"کیسی ناانصافی کی بات ہے۔" جیل کے اندر ایک قیدی نے دوسرے سے کہا: "میں پچھلی بار یہاں آیا تھا تو مجھے پڑھایا گیا، دستخط کرنے سکھائے گئے اور اب مجھے جعلی چیک پر دستخط کرنے کے الزام میں پکڑ لیا ہے۔"
(فرحان، ناظم آباد، کراچی)

ایک صاحب انگلینڈ میں قیام کے بعد واپس آئے اور بازار میں خریداری کے لیے نکلے۔ ان کا بچہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ خریداری کرتے ہوئے وہ مٹی کے برتنوں کی دکان کے پاس پہنچے تو بچے نے ایک گھڑے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: "ابو یہ کیا چیز ہے؟"

"بیٹا اس میں پانی رکھتے ہیں اور پانی ٹھنڈا کرتے ہیں۔" باپ نے جواب دیا۔
بچہ بولا: "تو یوں کہیے نا کہ یہ پاکستانی فریج ہے۔"
(محمد عبدالعزیز، لیاقت کالونی، حیدرآباد)

گاہک: (فوٹوگرافر سے) میں یہ فوٹو کیسے لے سکتا ہوں، اس میں میری شکل تو بالکل خراب آئی ہے۔
فوٹوگرافر: آپ کو اس بات پر تصویر کھنچوانے سے پہلے غور کرنا چاہیے تھا۔
(آصف علی، کراچی)

شاگرد: (استاد سے) میرے خیال میں مجھے اس امتحان میں "سی گریڈ" نہیں ملنا چاہیے تھا۔
استاد: میرا بھی یہی خیال ہے، لیکن یہ سب سے کم تر گریڈ تھا جو میں تمھیں دے سکتا تھا۔
(عامر شہزاد، محلہ امرپورہ، راولپنڈی)

نوکر جب دستک کے جواب میں دروازہ کھولتا ہے تو باہر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا ہوتا ہے، نوکر واپس آ کر مالک سے کہتا ہے:
نوکر: باہر مونچھوں والا آیا ہے۔
صاحب: (جو کہ پہلے ہی غصے میں تھے) جاؤ اس سے کہہ دو، ہمیں نہیں ضرورت مونچھوں کی۔
(عامر فہیم رضا، کلگان، مانسہرہ)

ایک عرب نے کوئی سستا گھوڑا خریدا۔ جب وہ گھوڑا خرید کر جانے لگا تو اس نے تاجر سے پوچھا: "بھئی سچ سچ بتائیں، اس میں کوئی عیب تو نہیں ہے؟"
تاجر نے جواب دیا: "بخدا اس میں کوئی عیب نہیں ہے، صرف ایک پاؤں میں کھجور کے برابر زخم ہے، پیٹ میں انگور کے برابر گٹھلی ہے، ٹانگ پر نارنگی کے برابر پھوڑا ہے اور پیٹھ پر چھوٹے سے امرود کے برابر معمولی گھاؤ ہے۔"
عرب جھلا کر بولا: "تم گھوڑے بیچتے ہو یا پھل؟"
(لے منان خرم بٹ، الریاض، السعودیہ)

استاد: (شاگرد سے) کارگزاری کو جملے میں استعمال کرو۔
شاگرد: میرے ابا نے پل پر سے کارگزاری۔
(نوید خالد، بلاک نمبر ۲، ٹاؤن شپ، لاہور)

ایک آدمی اپنے بچے کو مار رہا تھا۔ بچّے کے رونے کی آواز سُن کر ایک پڑوسی آیا اور بولا: "کیوں صاحب، آپ بچّے کو اتنا کیوں مار رہے ہیں؟"

آدمی نے جواب دیا: "جناب، کل اس کا رزلٹ آ رہا ہے اور آج میں ایک مہینے کے ٹور پر جا رہا ہوں، سوچا آج ہی مار لوں۔"

(عالیہ ناز، مجاہد آباد، کراچی)

تین قیدی یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وُہ سب سے پہلے یہاں آیا ہے۔

پہلا قیدی: میں یہاں اس وقت آیا تھا جب لوگ ٹرین پر سفر کرتے تھے۔

دُوسرا قیدی: اور مَیں یہاں تب آیا تھا جب لوگ گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔

تیسرا قیدی: (معصومیت سے) یہ گھوڑے کیا ہوتے ہیں؟

(رفاقت علی، اتحاد کالونی، مُلتان روڈ، لاہور)

ایک نوجوان نے فقیر کو دس پیسے کا سکّہ دیا اور کہا: "میں ایک کلرک ہوں، میری ترقی کے لیے دُعا کیجیے۔"

یہ سُن کر فقیر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کلرک نے پُوچھا: "کیا ہوا بابا، آپ رونے کیوں لگے؟"

فقیر نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "تُمھاری ترقی کے لیے کیا دُعا کروں، میں تو خود ایک کلرک ہُوں۔"

(محمّد امین اسلم، بابو صابو، لاہور)

ایک آدمی ایران سے واپس پاکستان آیا۔ اس نے گول گپّے بکتے ہوئے دیکھے تو دکان دار سے پُوچھا: عدداً بیچ رہے ہو یا وزناً؟ (گن کر بیچ رہے ہو یا تول کر)

دکان دار کو کچھ سمجھ نہ آیا تو وُہ جھلا کر بولا: "یہ تم نے کیا دَنا دَن لگا رکھی ہے، میں تو گول گپّے بیچ رہا ہُوں۔"

(فرخ اکرام، میرپور، آزاد کشمیر)

ایک دوست: (دُوسرے دوست سے) کیوں بھائی، امتحان کب سے ہو رہے ہیں؟

دُوسرا دوست: پندرہ مئی سے۔

پہلا دوست: کوئی تیاری بھی کی ہے؟

دُوسرا: ہاں! ایک نیا قلم خریدا ہے، نئے کپڑے سلوائے ہیں اور ایک گھڑی خریدی ہے۔

(طاہر ندیم، محلہ سلیم پورہ، راہوالی، گوجرانوالہ کینٹ)

اشتیاق احمد

گمشدہ جزیرہ

ٹوں ٹوں کی آواز سُن کر وہ چونک اُٹھے۔ ٹمباش نے جلدی سے ایک الماری کی طرف قدم بڑھا دیے اور پھر ایک آلہ منہ کے قریب کرتے ہوئے بولا:

"یس باس! ٹمباش بول رہا ہوں۔ آپ کا خادم۔"

"انسپکٹر جمشید اور اس کے ساتھی کہاں ہیں اور کس پوزیشن میں ہیں – ہر لمحے خبر رکھو –"
"ان کے تین ساتھی اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں سر۔"
"یہ اچھی خبر ہے – انسپکٹر جمشید میری تلاش میں نکلا ہے – وہ سمندر کا چپہ چپہ چھان مارے، تب بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔"
"ہمارا بھی یہی خیال ہے باس – آپ تک تو ہم میں سے آج تک کوئی نہیں پہنچا۔ ان لوگوں کو ختم کرا رہا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"
"اس وقت ختم کرانا مناسب نہیں ہو گا – ابھی انسپکٹر جمشید آزاد پھر رہا ہے – جب تک وہ قابو میں نہیں آجاتا، انھیں زندہ رکھنا چاہیے، ہو سکتا ہے – یہ لوگ ہمارے کام آجائیں اور ان کی مدد سے ہم انسپکٹر جمشید پر ہاتھ صاف کر سکیں۔"
"او کے باس! ایسا ہی کیا جائے گا۔"
"وہ بے وقوف شاید ہوٹل شارتا اور ہوٹل نیاب میں ٹکریں مار رہا ہے – اسے کیا معلوم – ایسے تو میرے نہ جانے کتنے ہوٹل چل رہے ہیں، کس کس ہوٹل میں تلاش کرے گا وہ مجھے۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں باس۔" ٹمباش نے فوراً کہا۔
"اچھا بس – یہی کہنا تھا۔"
آواز بند ہو گئی – محمود نے فوراً اشفاق کی طرف دیکھا:
"جزیرے پر سنائی دینے والی باس کی آواز – کیا یہی تھی؟"
"ہاں – بالکل۔" اس نے کہا۔
"تب پھر – کم از کم مسٹر ٹمباش باس نہیں ہو سکتے – لہٰذا ہمیں یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں، آئیے نکل چلیں۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے –
"اے – خبردار اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے تم –" گنگو غرایا۔
اور پھر انھیں باندھ دیا گیا – جلد ہی ٹمباش، گنگو اور ان کے ساتھی انھیں تہ خانے میں چھوڑ کر جا چکے تھے – اتنی مہربانی انھوں نے ضرور کی تھی کہ ان کے منہ بند نہیں کیے تھے – شاید

اس لیے کہ ان کی آوازیں اوپر سُنی جانے کا امکان نہیں تھا:
"اب کیا کریں بھئی؟ خان رحمان بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔
"میں سوچ رہا ہوں انکل – کہیں اس بار ہم ناکام تو نہیں ہو جائیں گے – یہ باس تو شاید سات پردوں میں چھپا بیٹھا ہے۔"
"اللہ اپنا رحم فرمائے – بھئی پہلے ان رسیوں کا کچھ کرنا چاہیے۔" خان رحمان تلملا کر بولے۔
"ان رسیوں کی آپ پروا نہ کریں انکل۔" محمود مسکرایا۔
"کیا کہ رہے ہو بھئی – پروا نہ کروں – میری کلائیوں میں رسی گھُسی جا رہی ہے – کم بختوں نے بہت ہی کس دی ہے۔"
"اچھا تو پھر پہلے رسیاں ہی سہی – اپنے ہاتھ میرے منہ کی طرف لے آئیے۔" محمود نے کہا۔
محمود نے اپنے دانتوں کو رسی پر آزمانا شروع کیا – پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ خان رحمان کے ہاتھوں پر بندھی رسی کی ایک گرہ کھولنے میں آخر کامیاب ہو ہی گیا، لیکن ایسی تین گرہیں اور تھیں اور اسے اپنے دانتوں کی نانی یاد آتی محسوس ہو رہی تھی – رسیاں واقعی بہت زیادہ سخت باندھی گئی تھیں – خود اس کی کلائیوں کا بھی بُرا حال تھا – اشفاق کا حال تو ظاہر ہے، ان سے بھی برا ہو گا – اس خیال کے آتے ہی اس نے پھر کوشش شروع کر دی دس منٹ بعد دوسری اور اس کے پانچ منٹ بعد تیسری گرہ کھلی – اس کے بعد کام آسان ہو گیا – جلد ہی وہ بیٹھے اپنی کلائیوں کو مل رہے تھے –
دو گھنٹے بعد انھوں نے تہ خانے کا دروازہ کھولے جانے کی آواز سُنی – وہ پہلے ہی دروازے کے پاس جا کر بیٹھ چکے تھے – فوراً دائیں بائیں ہو گئے – تینوں کے ہاتھوں میں لکڑی کی پیٹیوں کے تختے تھے – محمود نے یہ تختے اپنے چاقو کی مدد سے الگ کیے تھے، پھر جونہی گنگو نے نچلی سیڑھی پر قدم رکھا – اس کے سر پر لکڑی کا تختہ پورے زور سے لگا – وہ چکرا کر گرا – اس کے پیچھے دوسرا آدمی خوف زدہ انداز میں اچھلا، لیکن اتنی دیر میں دوسری طرف سے خان رحمان اس کے سر پر تختہ برسا چکے تھے – اشفاق کا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا، کیونکہ کوئی تیسرا ساتھی دُوسرے کے پیچھے نہیں تھا – انھوں نے جلدی جلدی ان دونوں کو باندھا اور پھر

تہ خانے سے باہر نکل آئے - انھوں نے ہوٹل کے پچھلے دروازے کی راہ لی - باہر نکلنے کے بعد محمود نے پہلا کام یہ کیا کہ انکل کاشان کو فون کر دیا - اور احتیاطاً آئی جی صاحب کو بھی فون کیا - پندرہ منٹ بعد ہوٹل ٹمباش کو مکمل طور پر گھیرے میں لیا جا چکا تھا - تہ خانے کا دروازہ اب انھیں معلوم ہو چکا تھا اور ہوٹل کی انتظامیہ ہیروئن کی پیٹیوں کو ان کی نظروں سے نہیں چھپا سکتی تھی -

"یہ پہلی کامیابی ہوئی ہے ہمیں - ورنہ اس ہوٹل سے ہم آج تک سو گرام ہیروئن بھی کبھی برآمد نہیں کر سکے"۔

"اب تو پھر منوں کے حساب سے مل گئی ہے"۔ اشفاق مسکرایا۔

"لیکن افسوس - ہم ابھی تک باس سے بہت دُور ہیں - وہ نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے، اب ہمیں اجازت دیں - ہم اپنے حصے کے ہوٹل کا کام ختم کر چکے ہیں - اب باقی ساتھیوں کی خبر لیتے ہیں - وہ کہاں تک پہنچے ہیں"۔

"ہوں ٹھیک ہے - آپ لوگ جا سکتے ہیں - یہاں کا کام ہم سنبھال لیں گے"۔ آئی جی صاحب نے کہا۔

وہ باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئے -

"اب کہاں چلیں؟"

"ہوٹل شارنا میں تو ابا جان مُوجود ہیں - وہاں تو ہماری ضرورت نہیں - اس لیے ہوٹل نیاب چلتے ہیں، شاید اس گروپ کے کسی کام آ جائیں"۔

"بالکل ٹھیک"۔ خان رحمان نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوٹل نیاب کے ہال میں بیٹھے تھے - اور سوچ رہے تھے کہ پروفیسر صاحب وغیرہ کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھیں یا اسی طرح بیٹھ کر تیل دیکھیں اور تیل کی دھار دیکھیں - اچانک ان کی نظریں دروازے کی طرف جم کر رہ گئیں - انسپکٹر جمشید، آفتاب اور فرزانہ اندر داخل ہو رہے تھے :

"ہائیں! یہ گروپ بھی یہاں آ گیا - گویا اپنا کام یہ بھی ختم کر چکے ہیں"۔ محمود بڑبڑایا۔

"چلو اچھا ہے - ایک سے دو بھلے"۔ خان رحمان مسکرائے۔

"کیا کہ رہے ہیں انکل - ایک سے دو یا ایک سے چھ"۔ اشفاق مسکرایا۔

اُسی وقت انسپکٹر جمشید نے انھیں دیکھ لیا - حیرت زدہ انداز میں وہ تیر کی طرح ان کی طرف آئے :

"تم لوگوں کو تو ہوٹل ٹمباش کی طرف نہیں بھیجا گیا تھا"۔

"ہم وہیں سے آ رہے ہیں - تشریف رکھیے - تفصیل سُنا دیتا ہوں"۔

"یہاں پروفیسر صاحب اور ان کے ساتھی بھی نظر آئے یا نہیں؟"

"جی - ابھی تک نہیں"۔

وہ بیٹھ گئے - محمود اپنی کہانی سنانے لگا، اس کے بعد انسپکٹر جمشید نے شارنا ہوٹل کے واقعات سنائے - محمود ان کے خاموش ہونے پر بولا :

"تمام حالات انتہائی حیرت انگیز ہیں - باس سے زیادہ پُراسرار مجھے وہ جزیرہ محسوس ہو رہا ہے"۔

"اور مجھے جزیرے سے زیادہ باس، کیونکہ سارا چکر تو اسی کا چلایا ہوا ہے"۔

"ایک منٹ - میں ذرا ایک فون کر دوں گا"۔ یہ کہ کر انسپکٹر جمشید ہوٹل کی دیوار کے ساتھ بنے فون بوتھ میں چلے گئے - ایک منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی :

"میں انسپکٹر کاشان سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ باس کے دونوں آدمیوں کو چھڑانے کی کوئی کوشش تو ابھی تک نہیں کی گئی - انھوں نے بتایا ہے کہ ابھی وہ دونوں حوالات میں ہی ہیں اور اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی گئی"۔

"ہو سکتا ہے - ابھی باس کو ان کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی ہو - ہماری وجہ سے وہ بھی تو کچھ مصروف ہو گیا ہے - یعنی اسے بھی اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑ ہی رہا ہو گا"۔ فرزانہ نے خیال ظاہر کیا -

"ہاں! میں نے انسپکٹر کاشان سے کہ دیا ہے کہ جونہی کوئی اس قسم کی کوشش ہو - ہمیں اطلاع دے دی جائے - تاکہ ہم فوراً مدد کو پہنچ سکیں - سوال یہ ہے کہ پروفیسر صاحب پارٹی کہاں

ہے، کیوں نہ ہم ان کا کمرہ چیک کر لیں۔"

" جیسے آپ کی مرضی۔" اشفاق نے کہا۔

انھوں نے کاؤنٹر سے کمرے کا نمبر معلوم کیا اور اوپر پہنچے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا، تالے کے سوراخ سے اندر جھانکنے پر انھیں کوئی بھی نظر نہ آیا:

" وہ تو یہاں نہیں ہیں۔" آفتاب بولا۔

" جب ہم نے فون کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ کمرے میں نہیں تھے۔ ہوٹل سے باہر انھیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر کوئی ضرورت پیش آگئی تھی تو وہ کم از کم ایک ساتھی کو یہاں ضرور چھوڑ کر جاتے۔ اس کا مطلب ہے۔ وہ ضرور یہیں کہیں ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے خیال ظاہر کیا۔

" پھر اب کیا کیا جائے؟"

" ہم ان کا انتظار کریں گے۔ تالا کھول دو بھئی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود نے ماسٹر چابی نکالی اور فوراً ہی تالا کھول ڈالا۔ اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور کمرے کا جائزہ لیا۔ ان کے ساتھیوں کا سامان اندر موجود تھا۔ اور کسی قسم کی بے ترتیبی کے آثار نہیں تھے۔

عین اس وقت انھیں برامدے میں قدموں کی آواز سنائی دی۔

○

" اب ہمیں خود ہی اس کے کمرے میں جانا ہوگا۔ شاید اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے سوچا ہوگا۔ ہم اسے ایک ہزار سے زائد رقم دے سکتے ہیں۔"

" چلو ہمارا کیا جاتا ہے۔ دو ہزار دے دیتے ہیں۔ کام آجائیں گے بے چارے کے۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

وہ نیچے اتر آئے۔ محمود کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جلد ہی واپس آتا نظر آیا:

" ہوٹل کے پچھلی طرف بیروں کے کوارٹرز ہیں۔ رانو کے کوارٹر کا نمبر ۲ ہے۔"

اُن کے قدم اُٹھ گئے۔ کوارٹر نمبر ۲ کا دروازہ بند تھا۔ محمود نے دستک دی، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ نہ کسی نے دروازہ کھولا۔ اس نے دوبارہ دستک دی اور تیسری مرتبہ تو دروازہ

دھڑ دھڑا ہی ڈالا، لیکن اب بھی کوئی نہ آیا:

" دروازہ اندر سے بند ہے۔ اس کا مطلب ہے، رانو یا کوئی اور اندر ہے۔ دروازہ نہ کھولنے کی ضرور کوئی خاص وجہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ کیا ہوٹل کی انتظامیہ سے بات کریں؟" پروفیسر داؤد نے جلدی جلدی کہا۔

" ابھی ان سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ پہلے ہم کمرے کو اندر سے دیکھیں گے۔" محمود نے پُرجوش انداز میں کہا۔

" اور ایسے میں ہوٹل کا کوئی ملازم آگیا تو؟"

" وہ بعد کی بات ہے۔ فاروق۔ تم کسی طرح اس کوارٹر کے اندر کود سکتے ہو؟"

" یہ کوئی مشکل نہیں۔ اگر تم انسانی سیڑھی بنا لو۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے۔ تمام بیرے ہوٹل میں مصروف ہیں۔ جن کی چھٹی کا وقت ہے۔ وہ بھی تھکن سے چور اپنے کوارٹر میں موجود ہوں گے۔ لہٰذا کوئی انسانی سیڑھی کا نوٹس نہیں لے گا۔" فاروق نے کہا۔

اخلاق اور شوکی ایک دوسرے کے بازو کو تھام کر بیٹھ گئے، پروفیسر داؤد ان کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گئے، پھر فاروق ان کے کندھوں پر بیٹھ گیا، اب پہلے اخلاق اور شوکی کھڑے ہوئے، پھر پروفیسر، ان کے بعد فاروق کھڑا ہوا۔ اس طرح اس کے ہاتھ آسانی سے دیوار پر پہنچ گئے۔ جونہی وہ دیوار پر چڑھا، اس کے منہ سے نکلا:

" اوہو۔ دیوار کے اس طرف تو لکڑی کی سیڑھی موجود ہے۔ مجھے چھلانگ نہیں لگانا پڑے گی۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھی کے ذریعے دوسری طرف اتر گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے دروازہ کھولا تو اس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔

" خیر تو ہے؟" شوکی گھبرا کر بولا۔

" اندر چل کر دیکھ لیں۔ خیر ہے یا نہیں۔ ویسے اگر آپ لوگ اسے خیر کہہ سکتے ہیں تو ضرور کہہ لیجیے گا۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ کمرے کا منظر دل ہلا دینے والا تھا۔ رانو کی لاش فرش پر

اوندھے منہ پڑی تھی - اس کی کمر میں ایک خنجر دستے تک دھنسا ہوا تھا، لیکن جس چیز نے انھیں حیرت زدہ کیا - وہ کمرے کے فرش پر پڑی کچھ چیزیں تھیں - رانو کی لاش سے ایک قدم کے فاصلے پر لکڑی کی پیٹی موجود تھی - چھوٹی سی پیٹی - اس کا ڈھکنا اکھاڑ گیا تھا - اس کے گرد لگی کیلوں کو ایک ہتھوڑی کی مدد سے نکالا گیا تھا - نکالی گئی کیلیں اور ہتھوڑی بھی پیٹی کے پاس ہی بکھری پڑی تھیں - لکڑی کی پیٹی بالکل خالی تھی -

انھوں نے بغور ان چیزوں کا جائزہ لیا - خون فرش پر بہ کر دروازے تک چلا گیا تھا -

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رانو بابا ہمیں ایک ہزار روپے کے بدلے میں کوئی چیز دینا چاہتے تھے، وُہ چیز اس پیٹی میں انھوں نے بند کر کے رکھی ہوئی تھی - ہم سے بات کر کے وُہ یہاں آئے - ہتھوڑی کی مدد سے پیٹی کھولی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس چیز کو پیٹی سے نکال سکتے - قاتل اندر داخل ہوا اور چاقو ان کی پیٹھ میں گھونپ کر سیڑھی کے ذریعے دیوار پر چڑھا اور باہر کود گیا۔"

"لیکن اس نے یہ خطرہ کیوں مول لیا - وہ دروازے کے راستے بھی تو واپس جا سکتا تھا - دیوار پھلانگتے ہوتے دیکھ لیے جانے کا زیادہ امکان تھا - دروازہ کھلا چھوڑ جانے میں اس کا کوئی نقصان نہیں تھا۔"

"اس نے ایسا کیوں کیا - ہم اس پر بھی غور کریں گے - پہلا سوال یہ ہے کہ وُہ ہمیں کیا دینا چاہتا تھا؟ یا کیا بتانا چاہتا تھا؟ اس پیٹی میں کیا تھا؟"

"معاملہ بہت پُراسرار ہو چلا ہے - ایک آدمی بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے - اور اس کا ہمیں ذاتی طور پر افسوس ہے - اس کی جان ہماری وجہ سے گئی - اگرچہ لکھی اسی طرح تھی - اس سے پہلے کہ ہم پولیس کو فون کریں - کمرے کی تلاشی لے لی جائے۔"

انھوں نے جلدی جلدی تلاشی لی - کچھ پرانی چیزیں ملیں - ان کا جائزہ لیے بغیر ایک طرف رکھ دیا گیا -

"کیا خیال ہے - اب انکل کاشان کو فون کر دیا جائے؟"

"ہاں! یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا - بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں - باقی دو پارٹیوں کو بھی یہیں بُلا لیا جائے - اس معاملے کا سُراغ اگر ملے گا تو یہاں سے - ورنہ رانو بابا کو قتل نہ کیا جاتا۔" پروفیسر داؤد بولے -

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا انکل - لیکن میں چاہتا ہوں - انھیں آواز نہ دی جائے - کیوں نہ ہم خود ان تک پہنچیں۔" فارُوق نے پُرجوش انداز میں کہا -

"خیر - جیسے تمھاری مرضی۔"

فاروق فون کرنے چلا گیا - ابھی تک ہوٹل کے کسی آدمی کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ کیا ہو چکا ہے - جب پولیس آئی، تب ان کے کان کھڑے ہوئے - مسٹر زیاٹا دوڑتا ہوا آیا -

"کیا بات ہے جناب - آپ ادھر کیسے تشریف لے آئے؟"

"آپ کے ہوٹل میں ایک عدد قتل کی واردات ہو گئی ہے - آپ کو معلوم تک نہیں۔" سب انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا - انسپکٹر کاشان فون پر نہیں مل سکے تھے - فون جس نے بھی سُنا، فارُوق نے اسی کو قتل کی اطلاع دے دی تھی - یہ شاید انسپکٹر کاشان کا ماتحت تھا - اخلاق اور شوکی کو اس نے پہچاننے کے انداز میں سر ہلا دیا -

معمول کی کارروائی شروع ہوئی اور پھر پولیس لاش لے گئی - اب انھوں نے دوسروں کی نظریں بچا کر وُہ چیزیں اُٹھا لیں اور اپنے کمرے کا رُخ کیا -

فارُوق نے چابی گھمائی اور دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا، دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے زوردار انداز میں نکلا:

"ارے!"

"یا اللہ رحم! یہ ارے کہاں سے ٹپک پڑا۔" یہ کہتے ہوئے شوکی اندر داخل ہو گیا، لیکن اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا:

"ارے!"

"اوہو - آخر کیا ہو گیا ہے بھئی۔"

پروفیسر داؤد بولے اور آگے بڑھے، اخلاق نے بھی ان کا ساتھ دیا -

"اب اس ارے ارے کو چھوڑو اور یہ بتاؤ - کہاں سے آ رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی بس کیا بتائیں - ایک عدد قتل کرا کے آ رہے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ارے باپ رے!" اشفاق گھبرا گیا۔

"جلدی سے تفصیل سُنا دو - تاکہ ہم بھی سنا کر فارغ ہو جائیں اور پھر مل کر غور کر سکیں۔"

ایک دُوسرے کے حالات سُنے گئے - ان تمام واقعات میں رانو بابا کا قتل انھیں سب سے عجیب بات نظر آئی۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور لگے غور کرنے:

"آخر وہ تم لوگوں کو کیا دینا چاہتا تھا؟" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"وُہ وُہ چیز دینا چاہتا تھا جو اس نے لکڑی کی پیٹی میں بالکل محفوظ کی ہوئی تھی۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"بس بھائی - تم تو چُپ ہی رہو۔" محمود نے بھنّا کر کہا۔

"اب لگے ہاتھوں ان چیزوں کو دیکھ لیں - جو رانو کے کمرے سے ہم نے پار کی ہیں - مطلب یہ کہ جن کی بھنک پولیس کو نہیں پڑنے دی۔"

"ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا - خیر۔ اب تو ہو گیا - نکالو وُہ چیزیں۔"

انھوں نے جیبوں میں سے چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں - ان چیزوں پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر جمشید زور سے چونکے - ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ تیزی سے آگے کو جھک گئے اور بغور ایک ایک چیز کو دیکھنے لگے - یہ واقعی کچھ عجیب سی چیزیں تھیں۔ اور سرسری نظر سے دیکھنے پر ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں —

"ان چیزوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے - رانو بابا کسی زمانے میں ماہر نقب زن تھا۔ وُہ نقب لگا کر چوری کی وارداتیں کیا کرتا تھا۔ یہ تمام چیزیں چوری کی واردات کرنے میں کام آنے والی ہیں۔ مثلاً یہ رسی، چاقو اور یہ ننھی سی مشین - اس مشین کے دستے کے گرد جب اس رسی کو لپیٹا جائے اور مشین کے منہ میں جب اس چاقو کو فٹ کر دیا جائے تو پھر دیوار بے چاری میں سوراخ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چھوٹے سوراخ کو بڑا کرنے کے لیے ہتھوڑی سے کام لیا جاتا ہے - ہتھوڑی پہلے ہی لکڑی کی پیٹی کے پاس ہمیں مل چکی ہے۔ باقی چیزیں عام استعمال

کی ہیں ثابت ہوا، کسی زمانے میں رانو بابا نقب زن تھا - پھر۔ اس نے نقب زنی کیوں چھوڑی؟ خیر۔ یہ ایک الگ سوال ہے - اس شیر نے بھی مجھے الجھن میں ڈالا ہوا ہے۔ کاش۔ رانو بابا قتل نہ ہوتا۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آہ بھری۔

"مجھے وُہ پیٹی بار بار یاد آ رہی ہے۔ آخر اس میں کیا تھا - پیٹی کافی پرانی بھی ہے -- اس کا مطلب ہے - بہت عرصہ پہلے رانو بابا نے اس میں کوئی چیز بند کر کے رکھ دی تھی اور اس موقعے پر وُہ چیز تم لوگوں کو دکھانے پر مجبور ہو گیا - لیکن کیوں۔ کیا صرف ایک ہزار روپے کے لیے - ہرگز نہیں - ایک ہزار روپے کے لیے کوئی شخص اتنے عرصے تک کوئی چیز اس قدر حفاظت سے نہیں رکھتا۔"

"تب پھر۔" پروفیسر جلدی سے بولے۔

"ابھی کیا کہہ سکتا ہوں - آؤ ذرا مسٹر زیاٹا سے ملاقات کر لیں۔" اُنھوں نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

زیاٹا نے ان سب کو الجھن کے انداز میں دیکھا:

"میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"آپ ہمیں رانو بابا کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں۔"

"میں - میں بھلا کیا بتا سکتا ہوں۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ بات تو طے ہے - وہ اس وقت سے یہاں ملازم ہے - جب یہ ہوٹل نیاب نہیں شاگرا تھا اور اس کے مالک کا نام البارو تھا - پھر مسٹر البارو سے ہوٹل آپ نے خرید لیا۔"

"ہاں! یہ باتیں تو ٹھیک ہیں - تو پھر؟" وُہ بولا۔

"البارو سے جس وقت آپ نے خریدا، رانو بابا ہوٹل میں ملازم تھا - آپ نے ہوٹل کو نئے سرے سے بنوایا، تو کیا آپ نے تمام ملازم پہلے ہوٹل والے ہی رکھ لیے تھے؟"

"کچھ مُلازم رہ گئے تھے - کچھ دُوسرے ہوٹلوں میں چلے گئے - وقت کے ساتھ ساتھ آخر وُہ سب غائب ہو گئے - صرف ایک رانو بابا رہ گیا تھا - آج وُہ بے چارہ بھی رخصت ہوا۔" زیاٹا نے جلدی جلدی کہا۔

"رانو بابا کے بارے میں کچھ تو بتائیں۔"

" کیا بتاؤں — وہ بہت ایمان دار تھا — اپنا فرض پوری طرح انجام دیتا تھا — اس نے شکایت کا کبھی موقع نہیں دیا تھا — کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا — دنیا میں بالکل اکیلا تھا — مطالبہ کرتا بھی تو کیا "

" اور البارو ؟"

" بھلا میں اس کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں — اس نے جب ہوٹل کی فروخت کا اشتہار اخبار میں دیا تھا — اس سے پہلے میں نے اسے دیکھا تک نہیں تھا — میں ان دنوں ایک ہوٹل بنانے کی سوچ رہا تھا — سو میں نے اس ہوٹل کا سودا کر لیا "

" بالکل ٹھیک — اور پھر آپ نے پورا ہوٹل گرا کر ایک بالکل نیا ہوٹل بنوایا — اس حد تک نیا کہ پرانے ہوٹل کی کوئی چیز نہیں چھوڑی "

" یہ بھی ٹھیک ہے " وہ مسکرایا۔

" سوائے ایک چیز کے — اور وہ ایک چیز ہے پتھر کا شیر "

" کک — کیا مطلب ؟" زپاٹا زور سے اُچھلا ، اس کی آنکھوں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں —

(جاری ہے)

چاند ستارے کویز نمبر ۱۵ کا انعام

درست جواب : ۱ — ڈنمارک ۲ — یافث ۳ — حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
۴ — حضرت عمر بن عبدالعزیز ۵ — بلال بن رباح

پچاس روپے فی کس نقد انعام حاصل کرنے والے

(۱) — محمد عارف انور خان ، پلاٹ ۲۲-۲۱ ، گلی نمبر ۲ ، شاہ ولی اللہ روڈ ، دریاآباد ، لیاری ، کراچی
(۲) — ناہید اختر ، سانده روڈ ، لاہور
(۳) — محمد محسن اقبال ولد اظہر حسین ، آر۔سی۔اے فیکٹری ، خانیوال
(۴) — مقبول حسین حیدری ، الکرم ٹریڈرز ، جامعہ مسجد روڈ ، خانیوال
(۵) — فیصل محمد صدیق ، ایم۔آر ۱۵/۵ مولوی مینشن ، اولڈ ڈسپنسری روڈ ، میٹھادر ، کراچی ۲

جاسوس بنیے

کیس نمبر ۱۴

رات کے بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے — باغ کے دوسری طرف صرف دو گھر نظر آ رہے تھے ، کیونکہ ان کے سامنے والے بلب جل رہے تھے — اس باغ میں سوائے میجر افتخار کے اور کوئی نہ تھا ، وہ تنہا آدمی تھا — رات کی خاموشی میں وہاں ایک بنچ پر بیٹھا سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا — اچانک اسے گلی سے کوئی آتا نظر آیا — وہ شخص باغ کے کنارے کھڑی ایک کار کے پاس رکا اور پھر اس کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا — کچھ دیر بعد وہ نکلا ، دروازہ بند کیا اور سامنے والے ایک مکان میں داخل ہو گیا — میجر افتخار جانتا تھا کہ وہ گھر مسز حمید کا ہے — مسز حمید بیوہ تھیں ، ان کے چار لڑکے تھے اور چاروں تعلیم حاصل کر رہے تھے —

میجر افتخار نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہ دی ، مگر اگلے دن کے اخبار میں خبر دیکھ کر وہ چونکا — خبر میں لکھا تھا کہ ایک کار میں سے ایک قیمتی کیمرہ اور کچھ چیزیں چوری کر لی گئی ہیں — اور خبر میں ان کے ہی علاقے کا ذکر تھا — میجر افتخار فوراً تھانے گیا اور انسپکٹر کو ساری بات بتا دی —

" میں نے چہرہ نہیں دیکھا تھا ، مگر وہ شخص مسز حمید کے گھر میں داخل ہوا تھا — اتنا مجھے یقین ہے ، مگر میں نے اس وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ چوری کر کے جا رہا ہے " — میجر افتخار نے بتاتے ہوئے کہا —

" تو آپ کا خیال ہے کہ مسز حمید کے بیٹوں میں سے کسی نے چوری کی ہے ؟"

" ظاہر ہے ، مسز حمید خود نہیں تھیں ، ان کے بیٹوں میں سے ہی کوئی ہو گا "

" ٹھیک ہے ، ہیں دیکھوں گا — آپ کی بہت مہربانی " انسپکٹر نے کہا۔

اُسی شام انسپکٹر مسز حمید کے گھر تھا۔ مسز حمید نے یہ سُن کر رونا شروع کر دیا کہ ان کے بیٹوں پر شک کیا جا رہا ہے۔

"نہیں، میرے بیٹے ایسے نہیں ہیں۔"

بہر حال انسپکٹر کی درخواست پر مسز حمید نے بیٹوں سے سوال و جواب کی اجازت دے دی۔ سب سے پہلے انسپکٹر سجاد کے کمرے میں داخل ہوا:

"مسٹر سجاد! میں پولیس انسپکٹر ہوں، آپ سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے؟"

"ہفتے کی رات کو ایک کار میں سے کچھ چیزیں چوری ہو گئیں اور چور اس گھر میں داخل ہوا تھا۔"

"تو کیا وُہ چور میں ہوں۔" سجاد نے کہا۔

"نہیں، میں یہ نہیں کہ رہا۔ میں نے چور تلاش کرنا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہفتے کی رات کو آپ کہاں تھے؟"

"میں ہفتے کی رات کو دوست کے ہاں فلم دیکھ رہا تھا، دس بجے کے قریب میں گھر واپس آ گیا تھا۔"

"کیا آپ نے کوئی عجیب چیز محسوس کی؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"کیا آپ کو فوٹوگرافی سے شوق ہے؟"

"تھوڑا بہت۔ زیادہ نہیں۔"

"کیا میں آپ کے کمرے کی تلاشی لے سکتا ہوں؟"

"بالکل، لیکن اگر آپ کیمرہ تلاش کر رہے ہیں تو وہ آپ کو نہیں ملے گا۔"

"کیا مطلب! آپ کس طرح کہ سکتے ہیں، مجھے کیمرے کی تلاش ہے؟" انسپکٹر نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے فوٹوگرافی کی بات کی تھی۔ میں سمجھا، آپ کو کیمرے کی تلاش ہے۔" سجاد نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر باہر کے دروازے کی طرف مُڑا:

"بہت بہت شکریہ! شاید مجھے پھر آنا پڑے۔" انسپکٹر یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

اگلا لڑکا شکیل تھا۔ انسپکٹر جب اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ ریڈیو پر کچھ تجربات کر رہا تھا:

"کیا آپ شکیل ہیں؟"

"بالکل ہوں۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، میں شکیل نہیں ہوں۔" اس نے ریڈیو پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ایسی تو بات نہیں۔ مگر میں پولیس کی طرف سے ہوں۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس گھر میں ایک چور ہے۔"

"کتنی دلچسپ بات ہے۔ آپ کے خیال میں میں نے کیا چرایا ہے؟" شکیل نے کہا۔

"ہفتے کی رات کو ایک کار سے فوٹوگرافی کا سامان چرایا گیا تھا اور چور اس گھر میں داخل ہوا تھا۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس رات کیا کر رہے تھے؟"

"میں۔ میں نے اس رات بہت سی چیزیں کی تھیں۔ مضمون لکھا تھا۔ خطوں کے جواب لکھے تھے۔ ریڈیو پر تجربات کیے تھے۔ گیارہ بجے میں بستر پر لیٹ گیا تھا۔"

"کیا آپ نے کچھ انہونی محسوس کی تھی؟ کیا آپ کے پاس ان باتوں کا ثبوت ہے؟"

"نہیں! مگر جب چوری ہوئی تھی، اس وقت میں اپنا پسندیدہ پروگرام سُن رہا تھا ریڈیو پر، جو ایک بجے تک جاری رہا تھا۔"

"ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"اچھا۔ اب میں تمھارے دوسرے بھائیوں سے مل لوں۔ شاید مجھے پھر بھی آنا پڑے۔"

اگلا بھائی سلطان تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ انسپکٹر نے تعارف کے بعد اس سے پوچھا:

"کیا آپ نے کوئی فوٹوگرافی کا سامان تو نہیں دیکھا گھر میں؟"

"نہیں!" اس کا جواب تھا۔

"اچھا! آپ ہفتے کی رات کیا کرتے رہے؟"

" میں نے ہفتے کا دن اور رات پڑھائی میں گزاری تھی۔ رات کافی دیر تک پڑھا تھا۔"

" تو کیا آپ ہفتے کی رات سیر کے لیے تو نہیں نکلے ؟"

" دیکھیں، میں جلد بھول جاتا ہوں۔ مجھے نہیں یاد۔ ہو سکتا ہے، میں سیر کے لیے گیا ہوں۔" اس نے کہا۔

" کاروں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟"

" میں جانتا ہوں کہ کار میں داخل کیسے ہوتے ہیں، باہر کیسے نکلتے ہیں۔ مگر افسوس کہ کار خرید نہیں سکتا، بہت مہنگی ہے۔"

" اچھا! میرا خیال ہے کہ آپ کا بھائی میری زیادہ مدد کرے گا۔"

انسپکٹر آخری بھائی کے پاس پہنچا۔ اختر۔ وہ کوئی سوٹ کیس بند کر رہا تھا:

" کیا آپ کہیں جا رہے ہیں ؟"

" آپ کو اس سے کیا۔ ویسے آپ ہیں کون ؟"

" میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ ایک چوری کے سلسلے میں آیا ہوں۔"

" اوہ!" اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

" یہ بتائیں، آپ ہفتے کی رات کیا گھر پر تھے ؟"

" ہفتے کی رات۔ ہاں اس رات میں گیارہ اور بارہ کے درمیان باہر تھا، مگر پونے بارہ بجے واپس آگیا تھا۔"

" سوچ لیں، وہ پونے بارہ ہی تھے۔ یا اس سے کچھ زیادہ ؟"

" نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پونے بارہ تھے۔"

" پھر آپ نے کیا کیا ؟"

" سونے کے لیے لیٹا تھا۔ ہاں ساڑھے بارہ کے قریب کوئی گھر میں آیا تھا۔ دروازے کی آواز آئی تھی۔" اختر نے بتایا۔

" کون تھا وہ ؟"

" یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

" وقت آپ کو کس طرح معلوم ہے ؟"

" میں نے اس وقت گھڑی دیکھی تھی۔ بارہ بج کر بیس منٹ سے اوپر وقت تھا، شاید ایک دو منٹ زیادہ تھے۔"

" اچھا، مگر آپ جا کہاں رہے ہیں ؟"

" میں ایک عرصے کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ اب میں سامان تیار کر سکتا ہوں ؟"

" ہاں ہاں! شوق سے کیجیے۔"

انسپکٹر وہاں سے واپس مسز حمید کے پاس آیا:

" یقیناً میرا کوئی بھی بیٹا چور نہیں نکلا ہوگا۔" مسز حمید نے پُرامید لہجے میں کہا۔

" نہیں مسز حمید! آپ کا ایک بیٹا چور ہے اور اس کا نام....."

آپ یہ بتائیں کہ چور کون ہے اور انسپکٹر نے کیسے پہچانا ؟

نوٹ: پہلے موصول ہونے والے تین درست جوابات پر چاند ستارے کی طرف سے ایک ایک قلم بطور انعام روانہ کیا جائے گا۔

کیس نمبر ۱۲ کا انعام

درست جواب: استاد جی جاتے وقت اپنے دستانے چھوڑ گیا تھا اور دستانے اُتار کر تالا کھولنے سے اس کی اُنگلیوں کے نشانات تجوری پر رہ گئے تھے۔

نوٹ: پہلے موصول ہونے والے تین درست جوابات پر درج ذیل تین قارئین کو ایک ایک قلم بطور انعام دیا جائے گا۔ (ادارہ)

- ملک محمد یعقوب، کوٹھی نمبر پی ۵۳۶، شیر پاؤ چوک، مقامِ حیات، سرگودھا
- انور جاوید، مکان نمبر ۹ بی، ملت کالونی، فیصل آباد
- عمران حسین، سی - ۱ - ۶۳۶ لانڈھی نمبر ۲، کراچی نمبر ۳۰

بے محاورہ لغت

محمد عادل منہاج

بے محاورہ لغت ایک ایسی لغت ہے جسے پڑھ کر آپ محاوروں کے درست مطالب سے آگاہ ہو جائیں گے۔ تو محاورے حاضرِ خدمت ہیں:

دال میں کچھ کالا ہے:

دال میں کچھ نہیں بلکہ بہت کالا ہے، بلکہ صرف کالا ہی کالا ہے۔ دال تو بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ عدسے کے ذریعے تلاش کرنا پڑتی ہے۔ اگر ایک کلو دال خریدیں تو اس میں صرف ایک چھٹانک دال ہوتی ہے بقایا اس میں کالا ہی کالا ہوتا ہے پھر ہم اس میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر الگ کرتے ہیں، جب بڑی جدوجہد کے بعد چند دانے دال کے مل جاتے ہیں تو اسے فخریہ طور

پر پکاتے ہیں، تو آپ جان گئے ہوں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے یا کالے میں کچھ دال ہے۔

ڈائن بھی دس گھر چھوڑ کر کھاتی ہے:

بڑا خوف ناک قسم کا محاورہ ہے مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ڈائن کو دس گھر چھوڑ کر کھانے کی کیا ضرورت؟ ان دس گھروں میں کیا چکر ہے؟ کافی غور و خوض کے بعد بھی جب کچھ پلے نہ پڑا تو یہ کیس کوہ قاف کی عدالت کے سپرد کر دیا، وہ جلد ہی ڈائن سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کریں گے۔ ہم آپ کو آج کل کے حوالے سے بتاتے ہیں کیونکہ آج کل ڈائنوں کا نہیں بلکہ چوروں کا زمانہ ہے اور چور دس گھر چھوڑ کر چوری کرنے کی زحمت نہیں کرتا بلکہ صرف اپنا گھر چھوڑ کر چوری کرتا ہے۔ ویسے بھی اسے جن گھروں میں چوری کرنا ہوتی ہے اس کی فہرست اسے پولیس والوں سے ملی ہوتی ہے اور اس میں صرف چند گھر ہی چھوڑے جاتے ہیں جو کہ . . . . (آپ خود عقل مند ہیں)

روپیہ روپے کو کھینچتا ہے:

روپیہ نہ ہوا مقناطیس ہو گیا بلکہ روپیہ مقناطیس سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ مقناطیس کو اگر مخالف سمتوں سے ملائیں تو وہ کشش کرنے کی بجائے ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں، جب کہ روپیہ اپنی ہر سمت سے روپے کو کھینچتا ہے اور کھینچتا ہی جاتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کی کھال بھی کھینچ لیتا ہے مگر اس طرح روپے کھینچنا بھی ایک فن ہے جس کے ماہر آج کل بہت ہیں اور دھڑا دھڑ روپیہ کھینچ رہے ہیں۔

سارا جاتا دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ:

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ محاورہ کس احمق نے بنایا ہے۔ بھلا کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمیں اتنا احمقانہ مشورہ دے کہ آدھا دیجیے بانٹ۔ بھلا ہم کیوں آدھا بانٹیں، ہم تو دوسروں کا بھی سارا حاصل کر لیں گے اور ہمارا "سارا" جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے یہ "سارا" بڑی محنت و مشقت سے جمع کیا ہے اور اس کے جانے کا اس لیے سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ ہم ہر ماہ "ان کا حصہ" دیتے رہتے ہیں۔

شکل مومناں کرتوت کافراں:

اس محاورے کے جواب میں تو ہم صرف ایک آہ ہی بھر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے کرتوت ہی ایسے ہیں۔ ہماری بغل میں چھری اور منہ میں رام رام ہوتا ہے۔ جائز ناجائز طریقوں سے دولت

حاصل کرتے ہیں۔ گھر والوں کی پرورش حرام سے کرتے ہیں، اپنے لیے جہنم تیار کرتے ہیں اور پھر کسی مسجد میں اعلانیہ چندہ دے کر یا بیوہ کو سلائی مشین دے کر تصویر کھنچوا کر خود کو مومن ثابت کرتے ہیں۔

غلطی کرنا انسان کا کام بخشنا رحمٰن کا:

دراصل یہ محاورہ بنا کر انسان نے غلطی کی ہے، کیونکہ اس محاورے کی بنیاد پر انسان دھڑا دھڑ غلطیاں کرتا ہے کہ بعد میں معافی مانگ لیں گے۔ ساری زندگی گناہوں میں گزار کر آخری عمر میں رشوت کی کمائی سے حج کر کے معافی مانگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بخشے گئے۔ انسانوں کو مشورہ ہے کہ وہ یہ بھی یاد رکھیں کہ غلطی پر معافی تو مل جاتی ہے، کیونکہ وہ واقعی رحمٰن ہے، مگر کبھی کبھی سزا بھی مل جاتی ہے اور وہ سزا بہت سخت ہوگی۔

کتے کا کتا بیری:

یقیناً کتے کا کتا بیری ہوتا ہے مگر انسان بھی اس معاملے میں کم نہیں اور انسان انسان کا اس حد تک بیری ہو چکا ہے کہ بے چارے کتے شرمندہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ کتے تو ایک دوسرے پر بھونک کر اپنا غصہ اتار لیتے ہیں مگر حضرت انسان قتل و غارت گری پر اتر آتا ہے۔ اپنے ہی بھائیوں کا خون بہاتا ہے، کبھی اسے گولیوں سے چھلنی کر دیتا ہے کبھی اس پر بم پھینک مارتا ہے یا ایٹم بم پھینک کر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے یعنی انسان، انسان کا اس حد تک بیری ہو چکا ہے۔

علم بڑی دولت ہے:

کسی زمانے کا ذکر ہے علم بڑی دولت ہوا کرتا تھا۔ ہائیں، آپ چونک کیوں اٹھے ہیں، بھئی یہ محاورہ واقعی بہت پرانے زمانے کا ہے جب علم بڑی دولت ہوا کرتا تھا آج کل تو علم بذریعہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر ڈگری کی کوئی نہ کوئی قیمت ہے اور آپ جب چاہیں قیمت دے کر ڈگری خرید سکتے ہیں۔ یعنی "دولت بڑا علم ہے"۔

مانگو اور ملے گا:

یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا تھا جب روئے زمین پر نیک لوگوں کی کثرت تھی اور وہ اتنے سخی تھے کہ لوگوں سے کہتے تھے مانگو اور ملے گا۔ اب چونکہ ویسے لوگ نہیں رہے، اس لیے

یہ محاورہ بولنا اب چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب یہ محاورہ بولنے کی کسی میں جرأت نہیں، لہٰذا آپ لوگ بھی کسی سے کچھ مانگنے کی جرأت نہ کریں۔ اگر غلطی سے کچھ مانگ لیا تو جواب میں سوائے پھٹکار کے اور کچھ نہیں ملے گا، البتہ اگر آپ کو پھٹکار کی ضرورت ہو تو آپ جی بھر کر مانگیں اور لے لیں گے۔

گڑے مُردے مت اکھیڑو:

یہ محاورہ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو گڑے مردے اکھیڑتے ہیں۔ ان بے شرموں کو اتنی شرم بھی نہیں آتی کہ وہ شخص جو ساری زندگی مصیبتیں جھیل کر اب ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے، اب تو اسے پریشان نہ کرے مگر ان لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ایک دن انہیں بھی اسی قبر میں جانا ہے، اگر کسی نے ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا.... ہائیں ؟ کیا ہوا ! اوہ آپ پوچھ رہے ہیں کہ وہ بے شرم کون ہے جو گڑے مردے اکھیڑتا ہے۔ بھئی وہ "کفن چور" ہے۔

سستا روئے بار بار مہنگا روئے ایک بار:

غلط، بالکل غلط۔ جب کوئی چیز سستی ہے ہی نہیں تو اس کے رونے دھونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل تو ہر چیز کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ ہر چیز کی قیمت پوچھتے ہی جان نکل جاتی ہے اور یہ مہنگی چیزیں بھی گئی گزری ہوتی ہیں، یوں ہم ہر وقت ہی روتے رہتے ہیں یعنی مہنگا خریدے بار بار اور روئے بار بار۔

نیم حکیم خطرۂ جان:

آج کل ڈاکٹروں کا زمانہ ہے اور ڈاکٹر گلی گلی دکان کھولے بیٹھے ہیں اور دکان کے باہر لکھا ہوتا ہے "ایم بی بی ایس"، یہ ڈاکٹر جو کمپاؤڈری سیکھ کر ایم بی بی ایس بن جاتے ہیں اور عوام کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں، انھی کے بارے میں کہا جاتا ہے نیم ڈاکٹر خطرۂ جان۔

یہ منہ اور مسور کی دال:

یہ محاورہ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو بہت امیر ہوتے ہیں۔ آپ چونک کیوں اٹھے بھئی۔ جب مسور کی دال سستی ہوتی تھی، تو یہ محاورہ غریبوں کے لیے بولا جاتا تھا اور چونکہ مسور کی دال بھی بہت مہنگی ہو چکی ہے، لہٰذا اب یہ محاورہ امیروں کے منہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یہ تھے کچھ محاورے اور ان کے بے محاورہ مطالب۔ اگر آپ کو ان کی تشریح پسند نہیں آئی تو کوئی بری بات نہیں۔ آپ ان کی کچھ اور تشریح کر لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ☆

قاضی کی جرأت

جاوید عبد الکریم

حیدر آباد دکن میں ایک مرتبہ قرآن خوانی کی مجلس ہوئی۔ میر محبوب علی خاں نے جو اس وقت نظام دکن تھے اپنے ایک صاحب سے کوئی بات شروع کی۔ اس مجلس میں قصبے کا ایک قاضی بھی موجود تھا جو حکومت سے پچیس روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ مجلس میں بڑے بڑے عالم موجود تھے مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ بادشاہ کو بات کرنے سے منع کرے۔

قاضی صاحب سے نہ رہا گیا، انھوں نے زور سے "ہوں" کی نظام چپ ہو گئے، لیکن تھوڑی دیر بعد پھر بات چیت کرنے لگے۔ قاضی نے دوبارہ زور سے "ہوں" کی۔ نظام پھر خاموش ہو گئے، لیکن تیسری دفعہ پھر انہوں نے کسی سے بات شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر قاضی صاحب کو غصہ آ گیا اور نظام کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا:

"بادشاہ سلامت میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ قرآن شریف پڑھا جا رہا ہو تو بات چیت ترک کر دینی چاہیے، جب آپ ہی قرآن مجید کا ادب نہ کریں گے تو اور کسی سے کیا امید ہو سکتی ہے ؟"

قاضی صاحب کی اس حرکت سے سب سہم گئے، لیکن نیک دل نظام "بہت اچھا" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو نظام نے قاضی صاحب کو بلا کر ان کا پتا پوچھا اور اس جرأت کے لیے قاضی صاحب کو پانچ سو روپے انعام دیا اور حکم دیا کہ ان کی تنخواہ بھی بڑھا دی جائے۔ جب قاضی صاحب کو انعام اور ترقی کا علم ہوا تو فرمایا:

"میں نے حق بات کہہ کر اپنا فرض پورا کیا ہے، میں اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتا۔" یہ کہہ کر انعام اور اضافہ دونوں واپس کر دیے۔

قرآن پاک کا احترام کرنا چاہیے اور جب قرآن شریف پڑھا جا رہا ہو تو خاموش رہنا چاہیے اور اگر کوئی بات چیت کرے تو اسے آرام سے سمجھائیں اور روکیں۔

قلب عباس گیلانی

حضرت موسیٰؑ کے دور میں ایک بار زبردست قحط پڑ گیا۔ جنگل سوکھ گئے، فصلیں تباہ ہو گئیں۔ لوگ فاقوں سے تڑپ تڑپ کر جان سے ہاتھ دھونے لگے۔ مصیبت کے اس وقت میں حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور گڑگڑا کر اپنی بے بسی کا حال سنایا کہ لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں کسی کو خوراک کا ایک لقمہ بھی میسّر نہیں ہے، اپنی رحمت نازل کر اور بارش برسا تاکہ قحط سے نجات ملے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا قبول فرمائی اور خوب بارش ہوئی۔ چند ہی دنوں میں جنگل ہرے ہو گئے اور فصلیں اگنے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد فصلوں کو مزید بارش کی ضرورت تھی، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا اور بارش کے لیے دعائیں کرنے لگے مگر دعاؤں کے صلے میں ایک بوند بھی نہ برسی۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہا، یا اللہ یہ تیرا کیا راز ہے پہلے تو نے میری دعا پر اتنی بارش برسا دی تھی، لیکن اس بار آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آ رہا۔

اسی لمحے حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے کہ میدان میں موجود ان لوگوں میں ایک بہت ہی چغل خور آدمی موجود ہے۔ اگر وہ اٹھ کر چلا جائے تو ابھی بارش ہونے لگے گی۔ یہ کہہ کر حضرت جبرئیلؑ چلے گئے۔

حضرت موسیٰؑ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم میں سے جو آدمی چغل خور ہے، یہاں سے اُٹھ کر چلا جائے تاکہ ہم پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ وہ آدمی دل ہی دل میں اللہ کو پکارنے لگا کہ یا اللہ! تیرا حکم ہے کہ عیبوں کی پردہ پوشی کی جائے۔ اگر میں اٹھ کر چلا جاؤں گا تو میرے سارے عیب ظاہر ہو جائیں گے اور میں سب کی نظروں سے گر جاؤں گا۔ اے میرے رب میں اپنے گناہوں کی سچے دل سے توبہ کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ مرتے دم تک برے کام نہیں کروں گا۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے، تو مجھے معاف کر دے۔

اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ ادا پسند آ گئی اور پھر خوب بارش برسی حتیٰ کہ قحط جڑوں سے اکھڑ گیا۔

Ameed

اُصلی مجرم

حفصہ اقبال

"وہ انہیں مارنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی وہ دہشت میں مبتلا تھے، کیونکہ شاید اس کا مقصد انہیں دہشت میں مبتلا کرنا ہی تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہے مگر وہ جو کوئی بھی تھا اس نے انہیں زبردست خوف و دہشت کا شکار کر رکھا تھا۔ اس کا مقصد شاید انہیں مارنا ہی ہو۔ مگر وہ اب تک حقیقت نہ جان سکے، کیونکہ ان کی نہ تو کسی سے دشمنی تھی اور نہ ہی لین دین۔"

سیٹھ حشام علی ایک بڑے بزنس مین تھے ان کا بزنس وسیع پیمانے پر تھا۔ وہ بہت امیر آدمی تھے ان کی ایک بیٹی حنا اور بیٹا ہارون تھے۔ وہ بہت نیک اور ایماندار آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا

کبھی کسی سے کاروباری جھگڑا نہ ہوا مگر پھر بھی کوئی سیٹھ حشام علی کا دشمن تھا۔ وہ ان پر دو قاتلانہ حملے کر چکا تھا۔ اس نے پہلا حملہ اس وقت کیا جب ایک صبح سیٹھ حشام علی کا آفس جانے کا پروگرام نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری کو بلایا تاکہ اسے جن فائلوں پر دستخط کروانے تھے، وہ وہیں کروالے۔ ان کا یہ سیکرٹری (جمال) کافی پرانا اور بااعتماد آدمی تھا وہ ان کے ساتھ کئی سالوں سے کام کر رہا تھا۔ خیر وہ سوئمنگ پول پہنچے اور انہوں نے سوئمنگ کے لیے پانی میں چھلانگ لگادی۔ کچھ دیر بعد جب انہوں نے باہر نکلنا چاہا تو انہیں محسوس ہوا کہ کوئی طاقت انہیں پانی میں دھکیل رہی تھی۔ جب بھی وہ سر باہر نکالنے کی کوشش کرتے، ان کا سر کوئی دوبارہ پانی میں ڈال دیتا۔ انہیں اپنا دم گھٹتا اور جان جسم سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب انہیں چھوڑا گیا تو وہ کسی بے جان جسم کی طرح پانی کی سطح پر تیرنے لگے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سر باہر نکالا اور تمام قوتیں جمع کرکے ریلنگ کو پکڑا اور باہر آئے۔ جونہی وہ باہر نکلے، یہ دیکھ کر ٹھٹھک گئے کہ جہاں وہ کھڑے تھے وہاں سے زمین پر پانی کے بنے ہوئے پاؤں کے بڑے بڑے نشانات دور تک چلے گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہاں ضرور کوئی آیا تھا انہوں نے سوچا۔ اتنے میں ان کا سیکرٹری ان کے پاس آیا۔

"سر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے ان کی حالت دیکھتے ہوئے کہا

"ہاں، میں ٹھیک ہوں" انہوں نے کہا

"تم نے یہاں کسی کو دیکھا تو نہیں" سیٹھ حشام ذرا دیر ٹھہر کر بولے۔

"نہیں سر، یہاں تو کوئی نہیں ہے، میں جب آیا تو آپ یہاں کھڑے تھے۔" ان کے سیکرٹری نے تعجب سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے" انہوں نے کہا۔ اب وہ کافی حد تک سنبھل چکے تھے اس لیے انہوں نے اندر کا رخ کیا۔

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جو ان کے ساتھ پیش آیا اور انہیں یقین تھا کہ ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے، مگر چونکہ ان کا کوئی کاروباری دشمن نہ تھا اس لیے وہ نہ سمجھ سکے کہ وہ کون تھا۔ انہوں نے گھر میں کسی کو کچھ نہ بتایا، کیونکہ وہ پریشان کرنا نہ چاہتے تھے۔ مگر وہ اس واقعے کے بعد کچھ محتاط سے ہو گئے۔

ایک دو ہفتوں کے بعد تمام کام معمول پر آ گئے مگر جب بھی ان کے ذہن میں وہ واقعہ آتا تو انہیں

عجیب سے خوف کا احساس ہوتا۔

ایک دن سیٹھ حشام کا گالف کھیلنے کا پروگرام تھا۔ انہوں نے صبح ہی اپنے سیکرٹری کو فون کرکے اپنے پروگرام کے متعلق بتایا اور کہا کہ وہ دفتر کے ضروری کام نپٹا کر اگر کوئی خاص کام ہو تو وہ اسی پارک میں آجائے جہاں وہ گالف کھیلتے تھے اور وہ ان کے گھر کے نزدیک ہی تھا۔ فون کرنے کے بعد جب وہ گھر پہنچے اور انہیں وہاں کھیلتے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوا تھا کہ انہیں تھکن سی محسوس ہوئی۔ انہوں نے کچھ دیر آرام سے بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اچانک ان کی نظر باڑ پر جا کر ٹھہر گئی۔ وہ بہت گھنی باڑ تھی اور اس کے آگے دو تین گھنے درخت تھے۔ اگر کوئی اس باڑ کے پیچھے بیٹھا ہو تو نظر نہیں آسکتا تھا کیونکہ ایک تو وہ کافی گھنی اور اونچی تھی اور دوسرا اس کے آگے درخت بھی گھنے تھے۔ انہیں اس باڑ میں پستول کی نال نظر آئی جس کا رخ انہی کی طرف تھا اور اگر انہیں نشانہ بنانا ہو تو آسانی سے بنایا جا سکتا تھا۔ اب اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتے تو انہیں آسانی سے گولی ماری جا سکتی تھی۔ وہ گھبرا گئے اور انہیں اپنی عقل ایک لمحے کو ماؤف سی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ اس کا دوسرا اور آخری حملہ تھا۔

"سر! ابھی کام تو مکمل نہیں ہوئے مگر یہ فائل۔۔"

اچانک ہی ان کے سیکرٹری کی آواز آئی۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ دیکھو۔۔۔ اسے پکڑو۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بھاگ جائے گا"

سیٹھ حشام علی نے ایک طرف اشارہ کیا اور ہکلاتے ہوئے بولے۔

"نو سر! ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت کچھ خراب ہے"! یہ کہہ کر ان کے سیکرٹری نے انہیں سہارا دیا اور کار تک لے آیا۔ اس نے کار کی پچھلی سیٹ پر انہیں لٹا کر کار کا رخ سیٹھ حشام کے گھر کی طرف کر دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے فوراً انہیں کار سے باہر نکالا اور سہارا دیتے ہوئے اندر تک لے آیا۔ اتنے میں بیگم حشام علی جو اس کمرے کی طرف ہی آرہی تھیں انہیں دیکھ کر گھبرا گئیں اور فوراً بولیں: "کیا ہوا، ان کی یہ حالت۔۔!"

سیکرٹری فوراً بولا: "کچھ نہیں بس ان کی طبیعت کچھ اچانک خراب ہو گئی تھی۔ آپ پلیز جلدی سے

ڈاکٹر کو فون کر دیں۔"

بیگم حشام نے فوراً اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا اور انہیں آنے کو کہا۔ ڈاکٹر قریباً بیس منٹ میں پہنچا۔ اس نے سیٹھ حشام کا چیک اپ کیا اور ایک انجکشن لگایا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب بولے،

"ان کا بلڈ پریشر اچانک ہائی ہو گیا تھا، ان پر شاید کچھ خوف طاری ہے۔ آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے نیند کا انجکشن تو لگا دیا ہے۔ اگر پھر طبیعت خراب ہو تو مجھے فون کر لیں اور دوائیاں میں نے لکھ دی ہیں، بازار سے منگوا لیں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب رخصت ہو گئے۔ سیٹھ حشام کا سیکرٹری جمال ابھی وہیں موجود تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ حشام صاحب کے جاگنے تک وہ وہیں رہے مگر بیگم حشام نے کہا کہ وہ اب وہاں موجود ہیں، اس لیے وہ جا سکتا ہے۔ انہوں نے اسے شکریے کے ساتھ رخصت کر دیا۔ یہ وہ واقعات تھے جن کی وجہ سے سیٹھ حشام علی پریشانی کے ساتھ خوف و دہشت کا شکار تھے۔

پہلی مرتبہ تو انہوں نے کسی کو نہ بتایا تھا مگر اس مرتبہ انہوں نے جب تمام واقعات اپنی بیگم کو سنائے تو وہ بھی بہت پریشان ہوئیں۔ انہوں نے سیٹھ حشام کو تسلی دی۔ اب تو سیٹھ حشام پر خوف اور دہشت طاری رہتا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ وہ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر جانے کے علاوہ کہیں اور نہ جاتے۔ نہ ہی کہیں باہر شکار وغیرہ کھیلنے کے لیے جاتے، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا اور یہ خدشہ بھی تھا کہ اب وہ تیسری مرتبہ بھی حملہ کرنے سے نہ چوکے گا اور ان کا خدشہ درست ثابت ہوا۔

ایک شام ان کی بیگم کچن میں اور ان کے بچے جرا اور ہارون اپنے کمروں میں پڑھائی میں مصروف تھے۔ سیٹھ حشام اسٹڈی میں ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھے کہ اچانک ایک سایہ ان کی کھڑکی کے پیچھے نمودار ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا، مگر سیٹھ حشام بے خبر پڑھنے میں مصروف تھے کہ اچانک وہ سایہ کھڑکی کے بالکل قریب آ گیا۔ فائر کی تیز آواز پورے گھر میں گونج اٹھی اور سیٹھ حشام کے ہاتھ سے کتاب دور جا گری۔ گھر کے سب افراد اور نوکر دوڑتے ہوئے ان کے کمرے کی طرف آئے۔

"پکڑو اسے... وہ بھاگنے نہ پائے... فوراً گیٹ پر پہنچو۔"

سبھی نوکر وہیں سے بھاگتے ہوئے باہر پہنچے مگر باہر تو دور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ شاید ایک بار پھر نکل چکا تھا۔ سیٹھ حشام کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ان کی بیٹی بھاگ کر ان کے لیے پانی لائی۔ انہیں فوراً پانی پلایا گیا اور سہارا دے کر کمرے میں لایا گیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اس لیے ان پر فوراً کمبل اوڑھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی۔

اس مرتبہ تو سیٹھ حشام کا پورا خیال تھا کہ انہیں پولیس کی مدد لے لینی چاہیے، کیونکہ مسئلہ کافی زیادہ حد تک سنگین صورت حال اختیار کر چکا تھا۔ سیٹھ حشام کا ایک دوست پولیس کے محکمے میں تھا۔ اس کا نام انسپکٹر شہریار تھا۔ انہوں نے انسپکٹر شہریار کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ تمام صورت حال سننے کے بعد انسپکٹر شہریار نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

"ہوں! تمہارا کوئی کاروباری دشمن یا کسی سے کاروباری جھگڑا؟"

"نہیں!" سیٹھ حشام نے جواب دیا۔

"تمہارا کہیں شراکت کا کاروبار تو نہیں؟" انسپکٹر شاہد نے دوسرا سوال کیا۔

"نہیں بالکل نہیں!" سیٹھ حشام نے کہا۔

"ہاں تمہارا کوئی خاندانی جھگڑا تو نہیں؟" پھر سوال کیا گیا۔

"نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔

"اچھا خیر میں اس کیس کے بارے میں سوچوں گا اور تمہارے ملازموں سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔ فی الحال میں ایک سپاہی کی ڈیوٹی تمہارے گھر کے سامنے لگا دیتا ہوں۔ وہ ہر اندر آنے والے کی چیکنگ کرے گا اور پھر کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔" انسپکٹر شہریار نے تفصیل سے انہیں آگاہ کیا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر شہریار نے اجازت مانگی۔

"نہیں بھئی! ابھی بیٹھو چائے تو پیتے جاؤ۔" سیٹھ حشام نے انہیں روکنا چاہا۔

"نہیں بس آج مجھے کوئی ضروری کام ہے پھر کبھی سہی۔ اچھا اب اجازت، خدا حافظ۔" انسپکٹر شہریار نے کہا۔ "ہاں! تم دفتر سے ایک دو ہفتے کی چھٹی بھی کر لو یعنی ایک دو ہفتے تک دفتر نہ جاؤ۔" جاتے جاتے انسپکٹر نے ہدایت کی۔

اس کے بعد اگلے ہی دن سب سے پہلے سیٹھ حشام نے اپنے سیکرٹری جمال کو فون کیا اور اسے فرم کے متعلق چند ہدایات دیں اور کہا: "میں ایک دو ہفتے تک آفس نہیں آؤں گا۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے یہیں آگاہ کر دینا۔" اس کے بعد انہوں نے چند ایک ہدایات دیں اور فون رکھ دیا۔

قریباً دو تین ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ نہ تو وہ کہیں باہر جاتے اور نہ ہی آفس۔ ایک دن گھر میں کوئی نہ تھا۔ ان کی بیوی اور بچے کسی تقریب میں شرکت کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ سیٹھ حشام کی طبیعت اچھی نہ تھی اس لیے وہ نہ جا سکے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد انہوں نے سونے سے پہلے اسٹڈی کا رخ کیا۔ ان کی عادت تھی کہ رات کو کچھ پڑھ کر ہی سوتے تھے مگر اس واقعے کے بعد انہوں نے اسٹڈی میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مگر آج انہوں نے کوئی کتاب پڑھنے کی غرض سے اسٹڈی کا رخ کر ہی لیا۔ انہوں نے ایک کتاب ڈھونڈی اور پڑھنے لگے۔ انہیں پڑھتے ہوئے قریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا اور وہ پڑھنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ انہیں پتا ہی نہ چلا کہ کب ایک ہیولا سا دروازے پر پہنچ چکا تھا اور اب وہ دروازے کے سامنے تھا۔ سیٹھ حشام علی نے آہٹ پر سر اٹھایا تو سامنے ہی اس شخص کو ریوالور سمیت دیکھا جو ان پر اب تک تین قاتلانہ حملے کر چکا تھا۔ اب وہ ان کے سامنے موجود تھا۔ ایک لمحے کو سیٹھ حشام کے دل میں سنسنی اور خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولے:

"اچھا تو تم ہو وہ شخص جو اب تک تین قاتلانہ حملے مجھ پر کر چکا ہے مگر ان کا مقصد شاید مجھے خوف میں مبتلا کرنا ہی تھا مگر تم آج اصل مقصد کی غرض کے لیے چوتھی مرتبہ آئے ہو۔"

"ہاں میں ہی ہوں وہ شخص، اور آج میں اپنے اصل مقصد کے لیے آیا ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

سیٹھ حشام نے چند لمحے اس کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی زیادہ عمر کا آدمی نہ تھا اور نہ ہی کوئی عادی مجرم معلوم ہوتا تھا بلکہ وہ ایک نوجوان تھا۔

"مگر کیا تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ مجھے مارنے سے تمہارا کیا مقصد ہے، کیونکہ میں نے تو آج تک تمہیں نہیں دیکھا۔" سیٹھ حشام بولے۔

"یہ تو تم مرنے کے بعد ہی جانو گے کہ میں ہوں کون۔" اس نے طنزاً کہا۔

"اگر مجھے مارنا ہی چاہتے ہو تو بتا دینے میں کیا حرج ہے؟" سیٹھ حشام پھر بولے۔

"اچھا سننا چاہتے ہو تو سنو۔"

"یاد کرو! آج سے بیس برس پہلے جب تم نے بزنس شروع کیا، تو تمہارا بہت معمولی کاروبار تھا۔ پھر تم نے اپنے ایک دوست کے ساتھ شراکت کی۔ تم دونوں جگری دوست تھے۔ تم دونوں نے مل کر کاروبار کیا جس سے تمہارے کاروبار نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی اور پھر تم دونوں کا ایک کاروباری معاہدے پر جھگڑا ہو گیا۔ پھر تم نے اسے مارنے کا منصوبہ بنایا اور تمہارے منصوبے کی تکمیل اس وقت ہوئی جب ایک رات اس نے تمہیں رات کے کھانے پر بلایا اور تم نے اس کے کھانے میں ایک نوکر کے ذریعے جو اس کا باورچی تھا زہر ملوا دیا اور پھر اس کا کام تمام ہوا اور تم جائداد کے اکیلے وارث بن بیٹھے اور تم نے وہ شہر چھوڑ دیا اور یہاں کے کامیاب بزنس مین طبقے میں تمہارا شمار ہونے لگا۔ میں اسی بدنصیب کا بیٹا ہوں اور آج میں تمہیں قتل کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھانے آیا ہوں جو برسوں سے میرے دل میں جل رہی ہے۔"

"تم نے کہانی کا آغاز تو بالکل ٹھیک انداز سے کیا مگر اس کا اختتام کرتے وقت تم اس غلطی پر ہو کہ زہر میں نے ملایا، زہر میں نے نہیں بلکہ۔۔۔"

"ہاں اب تم اپنا دامن بچانے کی کوشش کرو گے، خود کو بے گناہ ثابت کرو گے مگر میں نے تمام باتوں کی تصدیق اس شخص سے کروا لی تھی جس نے میرے باپ کے کھانے میں زہر ملایا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تو پھر تم نے اسے کیوں پولیس کے حوالے نہ کیا؟" سیٹھ حشام نے پوچھا۔

"میں نے پولیس کی مدد اس معاملے میں لی ہی نہیں۔ اس شخص نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسی صورت میں مجھے تمام واقعات سے آگاہ کرے گا بشرطیکہ میں اسے پولیس کے حوالے نہ کروں اور ویسے بھی اس کے اس گھناؤنے جرم کے پیچھے اصل ہاتھ تو تمہارا تھا جس کی کھوج میں آج میں یہاں تک آیا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اچھا تو یہ بات ہے مگر اب تم میری بات بھی غور سے سنو۔ جس رات میں تمہارے گھر آیا تھا، اس رات کھانا تو ہم دونوں نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ اگر کھانے میں نوکر نے کھانا بناتے وقت زہر

ملایا تھا تو یقیناً میرے کھانے میں بھی ہوتا۔ کھانے کے بعد تمہارے والد یعنی سیٹھ کامران احمد نے مجھ سے چائے کے لیے کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس نے نوکر سے کافی منگوائی۔ پھر کچھ دیر کے لیے میں اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ جب میں لوٹا تو وہ صوفے پر آڑھا ترچھا پڑا تھا۔ اس کا رنگ نیلا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھوا تو اس کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس وقت اچانک میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر میں نے پولیس کو فون کیا تو گھر میں اس وقت کوئی بھی موجود نہیں۔ شک صرف مجھ پر ہی کیا جائے گا اور ویسے بھی اسے مردہ دیکھ کر دہشت طاری ہو گئی تھی، اس لیے میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے گھر روانہ ہو گیا اور اس کے بعد میں نے تمام کاروبار وہاں سے سمیٹا اور وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ مگر یہاں بھی مجھے نئے شہر میں اپنا کاروبار جمانے کے لیے کافی محنت کرنا پڑی جس کے بل بوتے پر آج میں اس مقام پر پہنچا۔" سیٹھ حشام نے اطمینان سے اسے تمام کہانی سنائی۔

تمام کہانی سننے کے بعد وہ کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔

"جہاں تک یہ سوال ہے کہ کھانے میں زہر ہوتا تو تمہارے کھانے میں بھی ہونا چاہیے تھا تو اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم نے صرف میرے باپ کے کھانے میں۔۔۔

"مگر وہ جھوٹ بھی تو بول سکتا ہے۔" سیٹھ حشام نے اس کی بات کاٹتے ہوئے فوراً کہا۔

"مگر میں کیسے اس بات کا یقین کروں؟" اس نے پوچھا۔

"ہوں! یہ سب تو اس نوکر کے بیان پر منحصر ہے۔" سیٹھ حشام نے کہا۔

"تم کہیں غلط بیانی سے کام تو نہیں لے رہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"اگر تم کسی بے گناہ کو مارنا چاہتے ہو تو چلاؤ گولی، میں تو تمہارے سامنے ہوں اور تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی حائل نہیں مگر مجھے مارنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ اگر میں بے گناہ ہوا تو تمہارے باپ سیٹھ کامران احمد کا اصل قاتل تو بچ جائے گا۔"

سیٹھ حشام سنجیدگی سے بولے۔

اس پر سیٹھ حشام کی باتوں کا کچھ اثر ہوا اور وہ بولا:

"اچھا! مگر اس نوکر کو کس طرح تلاش کیا جائے؟"

"ہاں، یہ بات غور طلب ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس کوٹھی پر خود جا کر معلوم کروں۔ وہاں سے شاید اس کا سراغ مل جائے۔" سیٹھ حشام کچھ دیر سوچ کر بولے۔

"مگر اس کے لیے تو مجھے پھر دوبارہ آنا پڑے گا۔ اگر تم نے پولیس کو اطلاع دے دی تو پھر۔۔ مگر یاد رکھو کہ اس صورت میں میں سمجھوں گا کہ تم نے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور پھر تم تو جانتے ہی ہو کہ میں اپنے مقصد میں پھر بھی کامیاب ہو جاؤں گا۔" اس نے سرد آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔" سیٹھ حشام بولے۔

"ٹھیک ہے، اب میں جاتا ہوں مگر اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے تک پہنچا اور چلا گیا۔

سیٹھ حشام کچھ دیر بیٹھ کر سوچتے رہے اور پھر وہ سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ قریباً آدھ گھنٹے کے بعد بیگم حشام اور ان کے بچے تقریب سے واپس آئے۔

اگلے دن ناشتے کی میز پر سیٹھ حشام سوچ رہے تھے کہ وہ انسپکٹر شہریار کو اس واقعے کے متعلق بتائیں یا نہیں، کیونکہ انہوں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ پولیس کی مدد نہیں لیں گے مگر انہوں نے سوچا کہ انسپکٹر شہریار ان کا دوست بھی تو ہے۔ وہ اس سے بحیثیت ایک دوست بھی تو مدد لے سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر انہوں نے انسپکٹر شہریار کو فون کیا مگر وہ گھر پر نہ تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے خود ہی کوشش کرنی چاہیے۔ سیٹھ حشام نے سوچا اور پھر انہوں نے سیٹھ کامران احمد کی کوٹھی کا رخ کرنے کا سوچا مگر وہ اس شہر میں نہ تھی، کیونکہ وہ تو شہر چھوڑ چکے تھے اور ان کی صحت لمبے سفر کی اجازت نہ دیتی تھی اس لیے انہوں نے سوچا کہ وہ اپنے دوست انسپکٹر شہریار کو فون کریں مگر وہ بھی انہیں گھر پر نہ ملے۔ شام ۳ بجے کے قریب انسپکٹر شہریار سیٹھ حشام کے گھر آئے اور انہیں فوراً کہیں چلنے کو کہا۔

"مگر کہاں کچھ پتا بھی تو چلے۔" سیٹھ حشام تعجب سے بولے۔

"یہ تمہیں پتا چل جائے گا، مجھے ذرا جلدی ہے، اس لیے ذرا جلدی ہی چلو۔" انسپکٹر شہریار بولے۔

پھر انسپکٹر شہریار نے سیٹھ حشام کو اپنی جیپ میں سوار کیا اور جیپ چل پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کچی بستی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک گلی کے باہر کار روکی اور سیٹھ حشام اور انسپکٹر شہریار دونوں کار سے اترے۔ انسپکٹر شہریار کا رخ ایک کچے سے گھر کی جانب تھا۔ وہاں رک کر انہوں

نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد اندر سے آواز آئی:

"اندر آجاؤ، کون ہے؟"

سیٹھ حشام اور انسپکٹر شہریار اندر داخل ہوگئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ اس میں ایک ہی کمرہ تھا جس میں ایک ضعیف سا آدمی لیٹا ہوا تھا۔ انسپکٹر شہریار سیٹھ حشام سمیت اس کمرے میں داخل ہوئے۔ سیٹھ حشام نے اس بوڑھے کو دیکھا تو جیسے انہیں کچھ یاد آگیا۔ اس بوڑھے کی شکل کہیں ..... دیکھی تھی۔ انہوں نے سوچا۔

"پہچانا اسے۔ یہ ہے وہ بوڑھا جس نے سیٹھ کامران احمد کی چائے میں زہر ملایا تھا۔" انسپکٹر شہریار بولے۔

"اچھا تو یہ ہے وہ، مگر تمہیں ..." سیٹھ حشام بولے۔

"یہ میں تمہیں پھر بتاؤں گا کہ مجھے کیسے پتا چلا۔" انسپکٹر شہریار ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولے۔

اتنے میں بوڑھے نے اٹھنے کی کوشش کی اور اٹھتے ہی بولا:

"صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے ہی سیٹھ کامران صاحب کی چائے میں زہر ملایا تھا، مگر اس کی سزا میں آج بھگت رہا ہوں۔ میرا جوان بیٹا شادی کے بعد اپنی بیوی سمیت کسی اور شہر چلا گیا اور میری بیوی کب کی مرگئی اور میں اس کال کوٹھڑی میں کسی دن اسی طرح جان دے دوں گا۔ میرا ضمیر ساری عمر مجھے ملامت کرتا رہا کہ میں نے ایک بے گناہ کی جان لی مگر انسپکٹر صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، مجھے معاف کر دیں صاحب، میری وجہ سے آپ پر اتنا بڑا الزام لگا اور وہ بڑی مشکل سے دوبارہ اس ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لیٹ گیا۔ سیٹھ حشام نے تعجب سے یہ سب کچھ سُنا اور حیرت سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر شہریار ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھانے لگے۔

"بابا! تمہیں کہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ اگر یہی بیان تم اس شخص کے سامنے دے دو جس کے متعلق میں نے تمہیں بتایا تھا تو سیٹھ صاحب تمہیں معاف کر دیں گے۔" انسپکٹر شہریار بوڑھے کو سہارا دیتے ہوئے بولے۔

بوڑھے کو سہارا دے کر انسپکٹر شہریار کار تک لائے اور اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ اب انسپکٹر شہریار تیزی سے ایک طرف کار دوڑا رہے تھے۔ قریباً تیس منٹ کے فاصلے کے بعد وہ ایک

ہوٹل کے سامنے رکے۔ انہوں نے سیٹھ حشام کو کار میں ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اتر کر ہوٹل میں داخل ہوئے۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر انہوں نے پوچھا: "روم نمبر ۲۳۹ کس منزل پر ہے؟"

مینجر نے کچھ دیر ایک رجسٹر سے دیکھنے کے بعد انہیں روم نمبر ۲۳۹ کا پتا بتایا۔ اس کے بعد انسپکٹر شہریار کار تک آئے اور سیٹھ حشام اور بوڑھے کو لے کر اندر داخل ہوئے۔ دوسری منزل پر روم نمبر ۲۳۹ کے پاس پہنچ کر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیٹھ حشام ان کے ساتھ تھے۔ کچھ دیر بعد اندر سے اُسی نوجوان کی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

اِدھر سے کوئی کچھ نہ بولا۔ کچھ دیر بعد اس نے دروازہ کھولا۔ سیٹھ حشام کو دیکھ کر وہ زور سے چونکا: "تم، تم یہاں کیسے آئے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔ انسپکٹر شہریار کو وہ پہچان نہ سکا، کیونکہ وہ سادہ لباس میں تھے۔

وہ تینوں اندر داخل ہوگئے۔ "تمہیں میرا پتا کس نے دیا؟" اس نے پھر پوچھا۔

سیٹھ حشام تو کچھ نہ جانتے تھے، اسے کیسے جواب دیتے۔ اتنے میں انسپکٹر شہریار بولے:

"تمہارا مقصد تو پورا ہوگیا ہے، پوچھو اس بوڑھے سے، اسی نے تم سے جھوٹ بولا تھا مگر آج یہ سب کچھ سچ سچ بتائے گا۔" انسپکٹر شہریار بولے۔

اس نے چونک کر بوڑھے کی طرف دیکھا اور اسے پہچاننے لگا۔ "ہاں تم ہی ہو وہ جس نے مجھے بتایا تھا کہ..."

"نہیں صاحب میں نے جھوٹ بولا تھا۔ آپ کے والد سیٹھ کامران کو میں نے ہی زہر دیا تھا اور یہ سب میں نے شمشیر خان کے کہنے پر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آپ کے والد ہی اس کے ساتھ کاروباری معاہدہ کرنے پر تیار نہ تھے اور انہیں مار کر وہ سمجھتا تھا کہ سیٹھ حشام صاحب اس کے ساتھ معاہدہ کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔ اس سے اس کو کروڑوں کا فائدہ ہو سکتا تھا مگر سیٹھ صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس شہر میں آباد ہو گئے اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں یہ سب باتیں جانتا ہوں تو اس نے مجھے بھی مروانا چاہا مگر میں وہاں سے بھاگ آیا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میری آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔" بوڑھا گڑگڑا کر بولا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری محنت رائیگاں گئی اور میرے والد کا اصل قاتل بچ گیا۔" وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔

"تمہارے والد کو مروانے کے بعد جب سیٹھ حشام صاحب نے بھی اس کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کیا۔ اس کے بعد پے در پے ایسے واقعات پیش آئے کہ وہ مقروض ہوتا چلا گیا اور آخر کار کنگال ہو گیا اور فاقوں تک نوبت آگئی اور اسی طرح ایک دن وہ ٹی بی سے مر گیا۔"..

انسپکٹر شہریار نے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اوہ اس کا مطلب ہے کہ میں کچھ نہ کر سکا۔" وہ دکھ سے بولا۔

"اس کی سزا تو وہ اپنے خدا سے پائے گا، لیکن اگر تم اسے مارتے تو اس کا مطلب تھا کہ تم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے۔" انسپکٹر صاحب بولے۔

"مگر تم کون ہو؟" وہ بولا۔

"میں، میں سیٹھ حشام صاحب کا دوست ہوں۔" انسپکٹر شہریار بولے۔

"اچھا سیٹھ صاحب مجھے معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو بہت تکلیف اور ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا۔" وہ بولا۔

"خیر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ قانون کا کام قانون کی حدود میں ہی کرنا چاہیے بیٹے۔" سیٹھ حشام جو اب تک خاموش تھے' بولے۔

"اچھا اب ہمیں اجازت، سارا راز تو کھل ہی چکا ہے۔" انسپکٹر شہریار بولے۔

"ہاں بیٹے! تم نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا آخر تم میرے مرحوم دوست کے بیٹے بھی ہو۔"... سیٹھ حشام بولے۔

"میرا نام راحیل ہے۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد میرے ماموں نے مجھے پالا پوسا اور انہوں نے ہی مجھے باہر کے ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ انھیں مجھ سے بہت پیار تھا کیونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اپنے وطن واپس آنے کے بعد میں نے اپنے باپ کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس طرح یہ سب ہوا۔" وہ بولا۔

"اچھا بیٹے! اب ہم چلتے ہیں۔ خدا حافظ۔" سیٹھ حشام بولے۔

اس کے بعد سیٹھ حشام، انسپکٹر شہریار اور وہ بوڑھا وہاں سے روانہ ہوئے۔ اس بوڑھے کو انہوں نے اس بستی میں اتارا اور سیٹھ حشام اس بوڑھے سے بولے۔

"بابا! میں نے تمہیں معاف کیا، کیونکہ لالچ کبھی کبھی انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ خیر یہ پیسے رکھ لو اور اس سے کوئی کام شروع کر لو۔"

"شکریہ صاحب! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔" بوڑھے نے ان کو دعا دی۔

وہاں سے انسپکٹر شہریار اور سیٹھ حشام روانہ ہوئے۔

"ہاں! اب مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سب ہوا کیسے۔" سیٹھ حشام بے چینی سے بولے۔

"صبر! سانس تو لینے دو، گھر چل کر آرام سے سب کچھ بتاتا ہوں۔" انسپکٹر شہریار مسکراتے ہوئے بولے۔ اس کے بعد سیٹھ حشام اور انسپکٹر شہریار گھر پہنچے اور انسپکٹر شہریار نے سیٹھ حشام کے ڈرائنگ روم میں انھیں یہ سب کہانی سنا کر ان کی بے چینی دور کی۔

"ہوا کچھ یوں کہ جس رات وہ لڑکا راحیل تمہارے گھر آیا اسی رات مجھے کوئی کام تھا اور میں رات کو دیر سے فارغ ہونے کے بعد یہاں سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا کہ میں تمہارے سیکرٹری کے متعلق بھی پوچھتا چلوں' کیونکہ مجھے پہلے بھی اس پر کچھ شک سا تھا۔ مجھے تمہاری اس عادت کا پتا ہے کہ تم رات کو سونے سے پہلے کچھ مطالعہ کر کے سوتے ہو۔ خیر جب میں گھر میں داخل ہونے کے لیے کال بیل بجانے لگا تو میں نے ایک سائے کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ سایہ دیوار پھاند کر تمہارے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی دیوار پھاند کر ہی اندر جانا مناسب سمجھا' کیونکہ بیل بجانے سے وہ چوکنا ہو جاتا۔ خیر میں اندر داخل ہوا اور اس سائے کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ سایہ آہستہ آہستہ اندر بڑھنے لگا۔ شاید اس وقت گھر میں کوئی نہ تھا۔ اس نے ایک دو کمرے دیکھے اور پھر اسٹڈی کا رخ کیا۔ جب وہ اندر داخل ہو گیا تو میں نے دیوار سے ٹیک لگا کر تمام باتیں سنیں اور جب وہ واپس جانے لگا تو میں فوراً سامنے والے کمرے میں گھس گیا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ گیٹ تک پہنچ چکا ہو گا تو میں نے بھی فوراً اس کا تعاقب کیا۔ رات کا وقت تھا اور میری جیپ ایک طرف اندھیرے میں کھڑی تھی۔ اس لیے اسے پتا نہ چل سکا۔ میں اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا کہ وہ جاتا کہاں ہے۔ اس کی کار تمہاری کوٹھی سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی

تھی۔ میں نے وہاں سے اس کا تعاقب کیا اور پتا لگایا کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں ہوٹل کے اندر تک اس کے ساتھ گیا اور میں نے اسے لفٹ میں سوار ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہاں سے میں اپنے گھر آیا۔ اگلے ہی دن میں اس نوکر کا پتا کرنے کے لیے اس شہر میں گیا۔ وہاں سے مجھے کافی دیر بعد معلوم ہوا کہ کوئی شمشیر خان نامی آدمی تو مر چکا ہے اور اس کا نوکر یہ شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جا چکا ہے اور اتفاق سے وہ یہی شہر تھا۔ پھر میں یہاں آیا اور چند بستیاں دیکھیں۔ کافی پوچھ گچھ کے بعد مجھے اس کا گھر معلوم ہوا۔ پھر میں نے اس بوڑھے کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ اگر اس شخص راحیل کے سامنے سب کچھ بتا دے گا تو سیٹھ صاحب اسے معاف کر دیں گے، وہ مان گیا، پھر میں اس ہوٹل میں دوبارہ گیا، کیونکہ میں نے سوچا کہ کہیں وہ ہوٹل تبدیل نہ کر لے۔ پھر میں نے وہاں کے مینجر سے معلوم کیا کہ اس حلیے کا کوئی لڑکا کس کمرے میں ٹھہرا ہے تو اس نے روم نمبر ۲۳۹ بتایا پھر میں تمہاری طرف آیا اور اس طرح یہ تمام کام ختم ہوا۔"

انسپکٹر شہریار نے تمام کہانی سنائی اور ایک طویل سانس لی۔

کمرے میں چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر سیٹھ حشام بولے:

"واہ یار! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ میرا تو خیال تھا کہ پولیس والے کاہل اور سست ہی ہوتے ہیں۔"

ہر طرح کے لوگ ہر محکمے میں پائے جاتے ہیں۔ مگر چند بُرے لوگ سارے کے سارے محکمے کو تباہ کرتے ہیں۔" انسپکٹر شہریار سنجیدگی سے بولے۔

"اچھا یار تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ خیر آؤ چائے پیتے ہیں۔" سیٹھ حشام انہیں سنجیدہ دیکھ کر بولے۔

"ہاں میری چائے تو ادھار ہے تم پر۔ آج یہ ادھار بھی چکا دو۔" انسپکٹر شہریار خوش گوار موڈ میں بولے۔

سیٹھ حشام نے نوکر کو بلا کر چائے لانے کو کہا۔

"ویسے یہ کیس بھی چائے سے شروع ہوا تھا۔ میرا خیال ہے بھابی کو ہی چائے لانے کا کہہ دو۔" انسپکٹر شہریار ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولے۔ اس پر سیٹھ حشام اور انسپکٹر شہریار کے قہقہے کمرے میں گونجنے لگے۔ ○

انجم سمیم

عید کا چاند

یہ ہمارے بچپن کی بات ہے جب انتیس ۲۹ روزے ہو جایا کرتے تو ہماری دادی اماں آواز دیا کرتی تھیں کہ چلو بچو چھت پر چڑھ کر عید کا چاند دیکھو اور ہم سب بھاگ بھاگ سب سے اوپر والی منزل پر کھڑے ہو کر عید کا چاند دیکھنے کی کوشش کیا کرتے اور کبھی کبھار اس مقصد کے لیے دادی اماں اور دادا ابو کی عینکیں بھی استعمال کیا کرتے تھے. جو سب سے پہلے چاند دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا اس کی نظر بہت اچھی سمجھی جاتی. کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ساتھ کھڑا چھوٹا بھائی پہلے چاند دیکھ لیتا اور ہم صرف غیرت میں آ کر چلا اٹھتے کہ ہم نے بھی چاند دیکھ لیا ہے. حالانکہ چاند کا دور دور تک نام و نشان نہ ہوتا. چھت پر ہی عید مبارک کا شور مچ جاتا اور گلے ملا جاتا لیکن بعد میں پتا چلتا کہ عید کا چاند نظر نہیں آیا اس لئے عید نہیں ہو گی. یہ تو بچپن کی بات تھی. آج کل عید رویئت ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق کی جاتی ہے. اور ٹی وی کے ذریعے عید کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق پتہ چلتا ہے. "عید کا چاند" والا محاورہ بھی پہلے نہیں ہوا کرتا تھا. یہ تو اس وقت سے وجود میں آیا ہے. جب سے رویئت ہلال کمیٹی نے چاند دیکھنا شروع کیا ہے. پہلے پہل ہم یہی سمجھا کرتے تھے کہ کمیٹی مل کر چاند دیکھنے کی

کوشش کرتی ہے. لیکن اب ہمیں شک ہونے لگا ہے کہ اصل میں کمیٹی مل کر عید کے دن کا فیصلہ کرتی ہے. اس موقع پر کمیٹی کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہوگی وہ یقیناً کچھ اس قسم کی ہوگی.

"ہاں بھئی! اس دفعہ کتنے روزوں کا پروگرام ہے؟ گرمی بہت ہے میرا تو خیال ہے انتیس کافی ہیں"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن پچھلے تین سالوں سے عید انتیس روزوں کے بعد ہی ہو رہی ہے. لوگوں کو شک پڑ جائے گا"

"پچھلے سال تو تم نے آنکھ کے آپریشن کے لئے باہر جانا تھا اس لئے انتیس روزے کروائے . اس سے پچھلے سال تو عید تیس کی ہی ہوئی تھی"

"ارے! وہ تو ریاض نے کروائی تھی کہتا تھا نعیم نے افطار پارٹی تب دینی ہے اگر روزے تیس ہوئے پوچھ لو اس سے"

"بھلا نعیم جیسے کنجوس شخص کی افطار پارٹی چھوڑی جا سکتی ہے"

"اچھا خیر اس دفعہ کا فیصلہ کرو"

"یار اس دفعہ تو روزے تیس ہی کرنے پڑیں گے"

"وہ کیوں؟"

"یاد نہیں اس دفعہ غلطی سے روزہ ایک دن پہلے رکھوا دیا تھا"

"تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے"

"اگر تیس روزے پورے نہ کیے تو ہماری اور سعودی عرب کی عید ایک ہی دن ہو جائے گی عین ممکن ہے کہ عید والے دن جوتے پڑ جائیں"

"اگر انتیس روزے پورے کیے تو عید جمعے کو آجائے گی"

"تو پھر؟"

"اس ملک میں عید جمعے کو نہیں ہو سکتی"

"وہ کیوں؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں"

"وہ کیا؟"

"پہلی تو یہ کہ جمعے کو دو خطبے دینے پڑیں گے"

"اور دوسری؟"

"وہ کچھ راز والی ہے"

"تو پھر کان میں بتا دو"

"نہیں! سمجھنے کی کوشش کرو"

"پھر بھی! کوئی اشارہ؟"

"ہاں وہ کچھ حکمرانوں سے تعلق رکھتی ہے"

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا"۔

"ایک تو کم بخت یونیورسٹی کے لڑکوں نے پتا نہیں کیسے سراغ لگا لیا کہ ہم نے روزہ ایک دن پہلے رکھوا دیا ہے"

"اگر سعودی عرب میں تیس روزے پورے ہو گئے تو ہمیں ایک دن بعد عید کا اعلان کرنا پڑے گا"

"لیکن اس طرح تو ہمارے روزے اکتیس ہو جائیں گے"

"صرف ہماری نظر میں"

"اور اگر یونیورسٹی کے لڑکوں نے شور مچایا تو؟"

"تو پھر سعودی عرب فون کرتے ہیں وہ کل عید کر لیں. ہم پرسوں کر لیں گے اس طرح جمعہ بھی بچ جائے گا"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا"

"لیکن سعودی عرب والے عید کا چاند دیکھ کر کرتے ہیں"

"تو پھر اب کیا کیا جائے"

"کسی صوبائی کمیٹی سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ان کا عید کے متعلق کیا پروگرام ہے"

"ہیلو! مولانا فیض کیا احوال ہیں؟ بس آپ کی دعا ہے۔ بتائیے عید تیس روزوں کے بعد ہی ہوگی نا"

"یہاں عید کا چاند نظر آگیا ہے۔ ہم کل عید کر رہے ہیں"

"کیا غضب کر رہے ہیں۔ کل تو سعودی عرب میں عید ہے"

"ہمارے کچھ علاقوں میں تیس روزے پورے ہو چکے ہیں.... اکتیس نہیں کر سکتے

"لیکن آپ کچھ تو خیال کریں"

"کیا خیال؟"

"یہی کہ ایک صوبہ عید منائے گا اور باقی روزے"۔

"اب ہم اعلان کر چکے ہیں۔ خدا حافظ"

"ارے! سنئیے تو۔ ہیلو! مولانا فیض"

"کیا ہوا؟"۔

"اب کیا ہوگا؟" تین صوبوں میں روزے اور ایک میں عید"۔

"چلو چھوڑو! چاروں صوبے پہلے کس بات پر متفق ہوئے ہیں۔ جو عید پر ہوں گے"۔

"پھر بھی عید تو پورے ملک میں ہمیشہ سے ایک ہی دن منائی جاتی رہی ہے"

"بس! اس سال سے یہ رسم بھی ختم۔ اپنا اپنا صوبہ۔ اپنی اپنی عید"-- ☆

- اگر دینا چاہو تو دین کی دعوت دو۔
- اگر بچنا چاہو تو مظلوم کی بد دُعا سے بچو۔
- اگر تیاری کرنا ہے تو آخرت کی کرو۔
- اگر رونا چاہو تو اپنے گناہوں پر روؤ۔
- اگر بیٹھنا ہے تو بزرگوں کی صحبت میں بیٹھو۔

(مرسلہ: محمد رضوان مغل، کراچی)

ان دیکھے دوست

● شمیم اقبال
عمر: ۱۵ سال مشغلہ: چاند ستارے پڑھنا
پتا: بمقام بورگی کرم چند، ڈاکخانہ قاضیاں، تحصیل گوجرخان، ضلع راولپنڈی

● شیخ احسن نصیر
جماعت: ہفتم مشغلہ: کیرم کھیلنا
پتا: ابوبکر بلاک اے ۳/۳۱ فیصل ٹاؤن، لاہور

● محمد اسلم انجم
عمر: ۱۱ سال مشغلہ: چاند ستارے پڑھنا
پتا: چک نمبر این پی/۲/۷، بستی رحمانی، ضلع رحیم یار خان

● تجمل حسین
جماعت: نہم مشغلہ: کرکٹ کھیلنا
پتا: گورنمنٹ ہائی سکول جھوڑانوالی ضلع گجرات

● * محمد زبیر
جماعت: ہشتم مشغلہ: چاند ستارے پڑھنا
پتا: ۴۹۹ - جی بلاک، گلشن راوی، لاہور

● عبدالقادر
عمر: ۱۶ سال مشغلہ: کہانیاں لکھنا
پتا: مکان نمبر ۷، گلی نمبر ۸، افشاں بلڈنگ نوآباد، کراچی

● محمد جاوید
جماعت دہم مشغلہ: قلمی دوستی
پتا: گورنمنٹ ہائی سکول ڈبگری گیٹ، پشاور

● محمد ذیشان جاوید عرف نومی
عمر: ۱۳ سال مشغلہ: کہانیاں پڑھنا
پتا: مکان نمبر ۱۲۷۶، وارڈ ڈی، نزد ریلوے مسجد، محلہ مکرانی پاڑہ، شہر ٹنڈو آدم

● اقبال حسین شاہد نقوی
مشغلہ: قلمی دوستی
پتا: ۷۰-۱ اے ریلوے روڈ، مظفر گڑھ

● شعیب احمد فیصل
عمر: ۱۷ سال   مشغلہ: مطالعہ کرنا
مکان نمبر ۹۱، سیکٹر نمبر ۳، کھلابٹ ٹاؤن شپ
ہری پور ہزارہ

● ایس شہزاد صدیقی
عمر: ۱۵ سال   مشغلہ: ٹکٹیں جمع کرنا
پتا: ۵۲ نشتر روڈ، میاں چنوں

● محمد اجود حقانی
عمر: ۱۵ سال   مشغلہ: چاند ستارے پڑھنا
پتا: محمد اسعد نیوز ایجنٹ علی پور، ضلع مظفر گڑھ

● محمد اشرف اعوان
عمر: ۱۷ سال   مشغلہ: چاند ستارے پڑھنا
پتا: بمقام جوکھیاں، ڈاک خانہ خاص تھانہ احمد نگر
تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ

● طارق سلیم
عمر: ۲۰ سال   مشغلہ: قلمی دوستی
پتا: حافظ میڈیکوز، مین بازار، محمدی چوک،
اشرف آباد، ڈاک خانہ نشاط آباد، فیصل آباد

● فیصل عمران ڈوگر
مشغلہ: بچوں کے رسائل پڑھنا
پتا: معرفت محمد سلیمان ڈوگر، محلہ مدینہ آباد،
ڈوگر چوک، کمالیہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

● ریحان الحق
عمر: ۱۴ سال   مشغلہ: چاند ستارے پڑھنا
پتا: بی تھری ندیم کارنر، نارتھ ناظم آباد، بلاک
این، کراچی

● رانا ہارون نثار
جماعت: نہم   مشغلہ: کرکٹ کھیلنا
پتا: گورنمنٹ ماڈل جناح ایفی شینسی ہائی سکول
سیالکوٹ کینٹ

● ہرپال کمار راجا
عمر: ۱۶ سال   مشغلہ: قلمی دوستی
پتا: معرفت شعیب سنز، ادھیانہ بازار، مینگورہ

● شہباز حیات
عمر: ۱۶ سال   مشغلہ: قلمی دوستی
پتا: ڈاک خانہ خاص چھوکر کلاں، کھاریاں،
ضلع گجرات

● محمد انور صدیقی
عمر: ۱۵ سال   مشغلہ: ادب سے لگاؤ
پتا: شاہ دین سٹریٹ، عقب مسجد گھوڑے
شاہ، شاہدرہ ٹاؤن، لاہور

● عامر صدیق
پتا: ۷۔ ایچ ماڈل ٹاؤن، لاہور

نجمہ گل، ظفر کالونی، فیصل آباد کو بہترین سوال پر ایک آٹوگراف بک ارسال کی جارہی ہے۔

سَو سُنار کی

نجمہ گل ——— ظفر کالونی، فیصل آباد
س: اگر ہوا کا بل بھی آنا شروع ہو جائے تو پھر؟
ج: پھر حکومت کو کوئی اور ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اے منان خرم بٹ ——— الریاض، السعودیہ
س: انکل! میں آپ کی ردّی کی ٹوکری خریدنا چاہتا ہوں، کتنے میں بیچیں گے؟
ج: جلد از جلد ایک ڈپلومیٹ پن بھیج دیں۔

میجر محمد لطیف راجا ——— سیالکوٹ کینٹ
س: اگر آپ کے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں اور آپ کی ایک خواہش پوچھیں تو آپ کیا خواہش ظاہر کریں گے؟
ج: قیامت کے دن عرشِ الٰہی کا سایہ مل جائے۔

آصف کریم ——— حیدرآباد
س: آپ کی نظر میں منافع خور کون ہے؟
ج: قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبرز۔

مزمل احمد انصاری ——— حیدرآباد
س: قیامت کے دن آپ سے نیک کاموں کے بارے میں پوچھا گیا تو کیا جواب دیں گے؟
ج: دامن نیکیوں سے خالی نظر آتا ہے، جواب کیا دے سکوں گا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہوں۔

محمد ظفر اللہ ضیاء ——— کمالیہ
س: غریبوں کے مقابلے میں امیر لوگ علمِ نجوم پر زیادہ یقین رکھتے ہیں، کیوں؟
ج: دولت انہیں واہموں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

محمد حنیف وقار ——— بہاول نگر
س: انکل! کیا کوئی کام سفارش کے بغیر ہو سکتا ہے؟
ج: ہاں! ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔

آصف احمد ——— نوآباد، کراچی
س: کیا آپ چاند ستارے بند کر رہے ہیں؟
ج: جی نہیں — فکر نہ کریں۔

ثاقب مجید ـــــــــ منگلا چھاؤنی

س : آپ کی عُمر کیا ہے ؟

ج : مَیں عورت نہیں ۔

جاوید شوکت ـــــــــ ساہی وال

س : اگر آپ محمد علی باکسر ہوتے تو ؟

ج : مجھے اتنی بڑی سزا تو نہ دیں ۔

جہانزیب معین ـــــــــ کراچی

س : انکل ! اگر آپ مصنّف نہ ہوتے ؟

ج : شاید گھسیارہ ہوتا ۔

جواد اسلم باجوہ ـــــــــ لاہور

س : اگر تمام مصنّفوں کو فوج میں بھرتی کر لیا جائے تو کیا ہوگا ؟

ج : فوج میں اضافہ ۔

جمال عبدالناصر عاصم ـــــــــ پنڈ دادن خان

س : جب آپ کو کسی سوال کا جواب نہ آئے تو آپ کیا کرتے ہیں ؟

ج : ردّی کی ٹوکری سے مدد لے لیتا ہوں ۔

جواد محب ـــــــــ گوجرانوالہ

س : نہ آپ اسلامی سال شُروع ہونے پر مُبارکباد دیتے ہیں اور نہ ہی انگریزی سال کے شُروع ہونے پر، کیوں ؟

ج : یہ طریقہ عیسائیوں کا ہے، ہمارا نہیں ۔

جاوید احمد شاکر ـــــــــ فیصل آباد

س : آپ نے کبھی الیکشن لڑا ؟

ج : جی ہاں ! بچّوں کے اُردو ادب کا الیکشن لڑ چکا ہوں اور ابھی تک بلامُقابلہ کامیاب چلا آ رہا ہوں ۔

چودھری ایم۔ شہباز ناز ـــــــــ گوجرانوالہ

س : غریب غریبی سے اور امیر امیری سے خوش نہیں ہیں تو خوش کون ہے ؟

ج : جو نہ غریب ہوں نہ امیر ۔

حارث قدیر ـــــــــ کراچی

س : اپنے نئے قلم کی عمر بتائیے ؟

ج : نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا !

جبیب احمد خان ـــــــــ گوجرانوالہ

س : انکل ! میں نے ایک دن میں دس نمازیں پڑھیں، بتائیں تو بھلا کون کون سی ؟

ج : چاند ستارے پیش کر سکتا ہوں ۔

حمیرا ممتاز ـــــــــ راولپنڈی

س : انکل ! اگر آپ کو بلیک لسٹ کر دیا جائے تو ؟

ج : ہو جاؤں گا ۔

حامد علی شاہد ـــــــــ لاوہ

س : اگر آپ کو عمران سیریز لکھنے کو کہا جائے تو ؟

ج : بہت مرتبہ کہا گیا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہوگی ۔

وہ رات کسی چور کے دل ہی کی طرح سیاہ تھی۔ فواد سڑک پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے سامنے موجود عمارت کو بھی دیکھتا جا رہا تھا جہاں کچھ دیر قبل نوید داخل ہوا تھا۔

اچانک فواد کے ذہن کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ نوید نیم تاریک فٹ پاتھ پر بالکل شکستہ حالت میں بکھرا پڑا تھا اور آس پاس کی زمین اس کے خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ فواد اسے نظر بھر کر دیکھنے سے قبل ہی خوف سے ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ رات آدھی بیت چکی تھی اور ارد گرد کوئی نہ تھا۔ اس نے جلدی سے دائیں بائیں دیکھا۔ نیم تاریک سڑک دُور دور تک بالکل ویران و سنسان پڑی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر سامنے والی عمارت کی ساتویں منزل کی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا اور دوبارہ نوید کی لاش کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی دراصل جس شے نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی تھی وہ نوید کی قابلِ رحم حالت میں بکھری ہوئی خون آلود لاش نہ تھی بلکہ سفید رنگ کا وہ لمبا سا لفافہ تھا جو کہ لاش کی سرد اور اکڑی ہوئی انگلیوں میں مُڑا تُڑا سا دبا ہوا تھا۔ اگر پہلی ہی ساعت میں اس کی نظر اس لفافے پر نہ پڑتی تو وہ لاش پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر وہاں سے رفوچکر ہو جاتا۔

فواد نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا اور دبے پاؤں بڑھ کر لفافہ نوید کی بے جان انگلیوں سے اچک کر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا۔

O

نوید، فواد اور اسد تین چور تھے۔ یہ تینوں ہم پیشہ خیابانِ ناصر کے ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہائش رکھتے تھے۔ نوید پہلی منزل پر رہائش پذیر تھا جب کہ اسد کی رہائش دوسری اور فواد کی تیسری منزل پر ——— تھی۔ تینوں اپنے پیشے کی بنیاد پر نہ صرف ایک دوسرے سے واقف تھے بلکہ ایک دوسرے کو ناپسند بھی کرتے تھے اور ہر وقت ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔

چار روز قبل نوید کی حرکات و سکنات میں غیر معمولی جوش و خروش کو دیکھ کر فواد متجسس ہو گیا تھا اور سائے کی طرح اس کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ فواد تو ایک طرف رہا، اپنے جسم کی طرح موٹی عقل رکھنے والے اسد تک کی رگِ تجسس پھڑک اٹھی تھی لیکن چونکہ وہ ذرا کاہل واقع ہوا تھا لہٰذا اس کی رگ ایک ہی بار پھڑک کر ڈھیلی پڑ گئی تھی جبکہ فواد کی چستی نے اسے نوید کا تعاقب کرنے پر آمادہ کر لیا تھا اور یوں وہ پُراسرار لفافہ اب اس کے قبضے میں تھا۔

فواد تیز تیز قدموں سے نیم تاریک سڑکوں سے گزر کر خیابانِ ناصر میں واقع اپنی گلی میں داخل ہوا اور خاموشی سے اپارٹمنٹ کی تیسری منزل پر پہنچ کر ابھی اپنے دروازے کے قفل کے سوراخ میں چابی داخل کرنے ہی کو تھا کہ دروازہ اندر سے کھلا اور اسد کی شکل نظر آئی۔

"ہیلو۔۔" اس نے بلا جھجک مسکرا کر کہا۔

"تم میرے اپارٹمنٹ میں کیا کر رہے تھے؟ چوری؟" وہ آگ بگولا ہو کر چیخا۔

"ناراض نہ ہو بھائی، میں۔۔"

"ناراض۔۔۔؟" فواد چلا کر بولا۔ "تم ناراض ہونے کی بات کرتے ہو؟ اگر اس وقت میرے پاس پستول ہوتا تو میں تمہیں بے دریغ گولی مار دیتا اور تمہاری لاش پولیس کے حوالے کر کے کہتا کہ یہ شخص میرے اپارٹمنٹ میں ڈاکا ڈالنے کے ارادے سے داخل ہوا تھا؟"

"فواد! بات دراصل یہ ہے کہ آج میں اپنے دھندے سے ناکام لوٹا ہوں۔ میری جیب بالکل خالی تھی اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تمہارا مہمان بننا چاہیے۔ تم نے برا تو نہیں مانا۔۔۔؟" اسد نے غیر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"یقیناً برا مانا۔" فواد دھاڑا۔ "میں پوچھتا ہوں تم اندر داخل کس طرح ہوئے؟"

"وہ دراصل میں نے تمہارے قفل کی ایک دوسری چابی بنوالی ہے۔" اسد نے بڑے فخر سے اپنے کارنامے کا انکشاف کیا۔ "پہلی تو تم نے چھین لی تھی۔"

"میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔" فواد نے کھوکھلی آواز میں دھمکی دی۔ اسد اس کے مقابلے میں کافی جسیم اور قد آور تھا، لہٰذا فواد کی دھمکی کی حیثیت کسی لطیفے سے کم نہ تھی۔ یہ بات خود فواد بھی جانتا تھا۔

"لاؤ چابی میرے حوالے کرو۔" فواد سخت لہجے میں بولا۔
"یقیناً۔۔" اسد نے انتہائی سعادت مندی سے کہا۔
"پھر میں تیسری بنوالوں گا۔"
"کیا۔۔۔؟؟ تمہاری یہ جرأت۔۔۔ ٹھیک ہے میں اپارٹمنٹ کے ناظم سے کہہ کر یہ قفل تبدیل کرالوں گا۔"
"بصد شوق فواد، بصد شوق، میں صرف دو دن میں اس نئے قفل کی چابی بھی بنوالوں گا۔" اسد نے ڈھٹائی سے اپنی بتیسی نکالی۔
"میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔" فواد زچ ہو کر بولا "تم نے پیٹ بھر لیا ہے۔ اب دفع ہو جاؤ۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

○

اسد کے جانے پر دروازہ دھماکے سے بند کرکے وہ کمرے میں پڑی ہوئی اپنی دل پسند آرام کرسی کی جانب تیزی سے لپکا اور اس پر نیم دراز ہو کر دھڑکتے دل اور پھڑکتی آنکھوں سے کمرے کی تیز روشنی میں لفافے کا معائنہ کرنے لگا۔ لفافے پر کچھ بھی تحریر نہ تھا اور یہ شے سارے معاملے کو مزید پُراسرار اور سنسنی خیز بناتی تھی۔ فواد کو یہ بات بے حد پسند آئی۔ لفافہ گوند سے خوب اچھی طرح چپکا ہوا تھا۔ فواد نے جلدی سے لفافہ چاک کرکے اپنا ہاتھ اندر داخل کر دیا۔ لفافے میں موجود جو پہلی شے اس کی انگلیوں سے ٹکرائی وہ ایک چپٹی اور لمبی سی چابی تھی۔ ساتھ ہی ایک کارڈ بھی تھا۔ اس نے انہیں تیزی سے باہر نکال لیا۔ کارڈ پر خوشنما روشنائی سے نوید کی تحریر میں ایک جملہ درج تھا:

زمرّد، آتش پارہ اسٹیشن کے بکس نمبر ۱۳۷ میں موجود ہے۔

فواد نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تحریر کو ایک بار پھر پڑھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ "کیسا زمرّد؟" اس نے حیرت سے سوچا۔ "اگر واقعی ایسی بات تھی تو نوید نے اسے ایسی غیر محتاط جگہ کیوں رکھ چھوڑا تھا؛ اور پھر خود ہی باضابطہ تحریری طور پر اس کی نشان دہی کرکے لفافے کو اس طرح سربمہر کرنے کی اسے کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟" دوسرے ہی لمحے اس نے فیصلہ کیا کہ صبح ہوتے

ہی وہ سب سے پہلے آتش پارہ جا کر اس کا پتا چلائے گا۔

○

صبح نو بج کر چار منٹ پر اس کی آنکھ کھلی۔ آج وہ زندگی میں پہلی بار اتنے سویرے بیدار ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک الجھن کے عالم میں بیٹھا سوچتا رہا کہ آتش پارہ جائے یا نہ جائے۔ پھر وہ اٹھا اور جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگا۔
چند منٹ بعد وہ مکمل طور پر تیار ہو چکا تھا۔ اس نے باہر جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو اس کے سامنے اسد کھڑا تھا۔
"ہیلو۔۔" اس نے حسبِ معمول کہا۔
"تم اس وقت میرے دروازے کے باہر کھڑے کیا کر رہے ہو؟ سوئے کیوں نہیں؟" فواد نے اسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے غرّا کر سوال کیا۔
"خود تم کیوں نہیں سوئے؟" اسد نے برجستہ پوچھا۔
"میں نہیں سو سکا۔" فواد باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "مجھے ضروری کام ہے۔"
"اگر معاملہ اونچا ہے تو میں تمہاری مدد کروں؟" اسد نے پُرامید لہجے میں سوال کیا۔
"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔" فواد درشتی سے بولا، "اللہ کے لیے میرا پیچھا چھوڑو۔۔۔ اور خبردار، آئندہ وہ چابی میرے قفل میں استعمال نہ کرنا، ورنہ میں تمہارا جبڑا توڑ دوں گا۔"
"ٹھیک ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم اتنی رازداری کیوں برت رہے ہو؟" اسد غرّایا۔
"کیوں کہ یہ ایک خواب ہے۔" فواد نے جواب دیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

○

اس چابی کو بکس نمبر ۱۳۷ کے قفل میں ڈالتے ہوئے فواد کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ اس نے دوسرے جواہرات اور قیمتی پتھر ضرور چرائے تھے، مگر کبھی زمرّد چرانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔
چابی گھماتے ہی لاکر کا چھوٹا سا آہنی دروازہ کھل گیا۔ فواد نے اس کے خانے میں اندر تک ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو ایک ننھا سا چوکور ڈبا اس کے ہاتھ آگیا۔ اس نے ڈبا خاموشی سے اپنے لباس

کی سامنے والی جیب میں ڈال لیا۔ اور جب وہاں سے نکل کر اپنے اپارٹمنٹ کی سمت روانہ ہوا تو اس کا جسم اندرونی جوش اور خوشی کے تحت تپ رہا تھا۔

O

فواد اپنی گلی میں داخل ہوا تو دانت پیس کر رہ گیا۔ اسد عمارت کے باہر کھڑا تھا۔
"کہو کیا رہا؟" فواد پر نظر پڑتے ہی اسد دور سے بلند آواز میں چہکا۔
"بہت بُرا۔" فواد سانپ کی طرح پھنکارا، "احمق کبھی تمہیں نیند بھی آتی ہے؟"
"اپنی قسمت میں نیند کہاں؟" اسد نے سرد آہ بھری۔
"تم نہیں سو سکتے، لیکن میں تو سو سکتا ہوں۔" فواد تیزی سے زینے طے کر کے اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا اور دروازہ اندر سے مقفّل کر کے زنجیر بھی چڑھا دی۔ پھر تیزی سے کچن کی لائٹ جلا کر لرزتے ہاتھ سے وہ چوکور ڈبّا جیب سے برآمد کیا اور اس پر چڑھے ہوئے کاغذ کو پھاڑ کر علیحدہ کیا۔ اُس نے جب ڈبے کا ڈھکن کھول کر اس میں سے زمرّد برآمد کیا تو اسے ایک لمحے کے لیے غش سا آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کبوتر کے انڈے جتنی جسامت کی سبز آگ دہک رہی تھی، لیکن اس کا جوش و خروش یہ سوچ کر ماند پڑنے لگا کہ اصلی زمرّد اتنی بڑی جسامت کا نہیں ہو سکتا۔ پھر اسے نوید کا خیال آیا جو کہ ان قیمتی پتھروں کا ماہر تھا۔ اس نے کارڈ پر زمرّد ہی تحریر کیا تھا۔
اسے یقین کرنا ہی پڑا کہ یہ زمرّد ہے۔ "اگر کسی کو اس بات کی ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی کہ اس کے پاس زمرّد ہے، تو اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔" یہ خیال آتے ہی وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے اس انتہائی بیش قیمت زمرّد کو چھپانے کے لیے جگہ ڈھونڈنی شروع کر دی۔ کوئی ایسی جگہ جہاں کسی کا خیال تک نہ جا سکے۔ خاص کر اسد کا جو اس کی عدم موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ میں گھس کر ہر چیز کی تلاشی لے لیتا تھا۔
آخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے زمرّد کو ٹائلٹ کے مخصوص ٹینک سے منسلک پانی میں تیرتے ہوئے ٹھوس ربڑ کے اندر چھپانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ربڑ کے اندر گہرا اور بڑا سا شگاف کیا اور زمرّد کو اس کے اندر داخل کر کے اس میں ایک جوڑا موزہ ٹھونس دیا تاکہ زمرّد نکل نہ جائے۔
اس تھکا دینے والے کام سے فارغ ہو کر اس نے لباس تبدیل کیا اور دوبارہ سونے کی غرض سے

بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

جوہری نے جواہرات پرکھنے کا مخصوص شیشہ لگا کر زمرّد کا ہر پہلو سے کافی دیر تک بغور معائنہ کیا۔۔۔
"کک۔۔۔ کیا۔۔۔ یہ اصلی ہے؟" فواد نے گھبرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ جوہری اس کے سوال کا جواب دیے بغیر اپنے معائنے میں مصروف رہا۔۔۔ اس کی لانبی مشاق انگلیاں انتہائی مہارت سے اس سرد بلوریں انڈے کو گھما پھرا کر اس کے اندر دہکتی ہوئی سبز آگ کا مشاہدہ کرتی رہیں۔۔۔ آخر کار اس نے مہر سکوت توڑی:
"ہاں یہ اصلی ہے۔"
فواد نے اطمینان اور سکون کی ایک گہری سانس لی۔ "اے اللہ تیرا شکر ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ۔۔۔ لیکن یہ کافی بڑی جسامت کا ہے۔ کیوں؟"
"یہ دنیا کا سب سے بڑا زمرّد ہے۔" جوہری نے نرمی سے کہا، "اور یہ بمپورستان کے خلیفہ سے تعلق رکھتا تھا۔"
"کس سے؟" فواد نے حیرت سے سوال کیا۔
"بمپورستان کے خلیفہ سے۔" جوہری نے پھر کہا۔
"عجیب نام ہے۔۔۔ یہ کب کی بات ہے؟"
"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم خیال ہے کہ یہ ڈیڑھ ہزار سال قبل کی بات ہے۔"
"ڈیڑھ ہزار سال۔" فواد بے اختیار ہنس پڑا اور زمرّد کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: "بہرحال اب وہ قبر سے اٹھ کر کوئی گڑبڑ کرنے سے تو رہا۔ اس کی قیمت کیا ہو گی؟" اس نے دریافت کیا۔
"میں نہیں جانتا۔" جوہری بولا۔
"کیا مطلب!! ہر شے کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے کسی کی زیادہ، کسی کی کم۔" فواد نے کہا۔
"لیکن میں اسے خریدنا نہیں چاہتا۔" جوہری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"دیکھو قاسم!" فواد اسے رام کرتے ہوئے نرمی سے مخاطب ہوا۔ "ہم دونوں ایک طویل عرصے سے انتہائی ایمان داری سے سودا کرتے آ رہے ہیں اور آج تک کبھی کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوئی ہے۔ تم نے مال کی جو قیمت لگائی۔ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لی، چنانچہ اس دفعہ بھی تم ہی اس کی قیمت کا تعیّن کرو۔"

"میں اِسے نہیں خریدوں گا۔" جوہری قاسم نے دوبارہ بلند لفظوں میں انکار کر دیا۔

"اللہ کے لیے قاسم! کیوں نہیں خریدو گے...؟" فواد قریباً چیخ پڑا۔ "تم نے اپنے منہ سے کہا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا زمرّد ہے اور بالکل اصلی ہے... تو اس اتنے بڑے اور اصلی زمرد کی کوئی قیمت ہوگی... یا کہ نہیں ہوگی؟"

"مجھے یہ زمرّد نہیں چاہیے۔" قاسم نے ایک بار پھر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس منحوس پتھر کو اپنے پاس رکھنا گوارا نہ کرتا۔"

"نہیں..." فواد نے قاسم کو غیر یقینی نظروں سے گھورا۔

"تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

فواد کی اس بات پر قاسم بگڑ کر بولا:

"بمپورستان کے خلیفہ نے ستّر جادوگروں، درویشوں اور چیدہ چیدہ تیراندازوں کو اپنے پاس جمع کیا تھا اور اُن سب نے مل کر اس زمرّد پر جادو کیا تھا کہ جو بھی شخص اسے اپنے پاس رکھے گا، کتے کی موت مارا جائے گا۔"

"پھر کیا ہوا...؟" فواد کی سانس اس کے سینے ہی میں رک گئی۔

"پھر یہ ہوا کہ چند سرپھروں نے اُسے چرا لیا اور غائب ہو گئے۔"

"پھر...؟"

"بددعا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور جن جن لوگوں نے اس سبز پتّھر کو ہاتھ لگایا تھا، کتے کی موت مارے گئے۔ یہ شروع سے ہوتا آ رہا ہے۔" قاسم نے طویل سانس لی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" فواد کی چبھتی ہوئی نگاہیں قاسم کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں، لیکن دوسرے ہی لمحے اسے نوید یاد آ گیا اور وہ یکایک خاموش ہو گیا۔

"لہٰذا میں اس منحوس زمرد کو اپنے پاس رکھ کر اس کی نحوست کا شکار ہونا نہیں چاہتا۔" قاسم نے کہا۔ فواد نے زمرّد خاموشی سے اٹھا کر ڈبے میں رکھا اور ڈبے کو کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ معاملہ طے نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے کہ میں کچھ دنوں کے بعد دوبارہ تمہارے پاس آؤں۔"

"مجھے شک ہے۔" قاسم اداس لہجے میں بولا۔ "آج تک کوئی بھی خلیفہ کی بددعا سے نہیں بچ سکا۔ تم بھی نہیں بچ سکو گے۔"

"بکواس..." ناصر بولا، "انتہائی بکواس۔" اور باہر نکلتے ہوئے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

O

فواد نے قاسم جوہری کی خرافات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ قاسم کو صبح کا ناشتہ ٹھیک سے ہضم نہیں ہوا ہوگا، اس لیے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا، لیکن یہ توہمات صرف قاسم تک ہی محدود نہیں تھے، بلکہ اس نے جتنے جوہریوں سے رابطہ قائم کیا۔ سب کا یہی جواب تھا۔ بعض نے تو زمرّد کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہ کیا۔

تھک ہار کر فواد گھر روانہ ہو گیا۔ وہ زمرّد فروخت کرنے میں سخت ناکام رہا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ اسے پھینک دینے پر بھی تیار نہیں تھا، کیوں کہ یہ بہرحال ایک قیمتی پتّھر تھا۔ جوں جوں وہ اس پتھر کے متعلق غور کرتا، اس کا ذہن اس سے وابستہ داستانوں کو قبول کرتا جا رہا تھا۔ وہ سارے کے سارے جوہری نہ احمق ہو سکتے تھے اور نہ وہمی، لیکن اُن سب کی متفقہ رائے کے مطابق پتّھر منحوس تھا۔ تنگ آ کر اس نے سوچا کہ کیوں نہ اسے کسی گندے نالے میں پھینک کر اس سے چھٹکارا حاصل کر لے، لیکن وہ اپنے اس خیال پر عمل نہ کر سکا۔

O

وہ ایک انتہائی سرد، بھیانک اور دہشت ناک آواز تھی۔ فواد کے سارے جسم میں کپکپاہٹ دوڑ گئی اور ٹیلی فون کا ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ "میں نے سُنا ہے کہ بمپورستان کا وہ زمرّد تمہارے پاس ہے۔" آواز میں بلا کی کڑک تھی۔ فواد کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کان کا

پر وہ چٹ جائے گا۔ بولنے والے کا لہجہ استفہامیہ نہیں بلکہ تحکمانہ تھا۔

"ہاں ...؟" فواد نے دانت بجنے سے بچانے کی غرض سے اپنا جبڑہ سختی سے بھینچ لیا۔ "ہاں، میرے پاس ہے۔"

"میں اسے خرید لوں گا۔" وہ پھٹی پھٹی سی بھیانک آواز فواد کی سماعت میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اتر گئی۔

"ک... کک... کیا! اس کی کیا قیمت د... دو... دیں گے۔" فواد ہکلایا۔

"اگر میں تمہیں اس منحوس پتھر کے عوض دس ہزار روپے پیش کردوں تو یہ ایک فیاضانہ پیش کش ہوگی۔" آواز نے کہا۔

"ج... جناب! یہ مناسب قیمت ہے۔" فواد بولا۔ "یوں سمجھیے پتھر آپ نے خرید لیا۔"

"اس صورت میں۔" آواز میں اب ایک قسم کا ٹھہراؤ آگیا تھا۔ "میں تمہیں چند ہدایات دینا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں، بصد شوق۔" فواد جلدی سے بول پڑا۔

"کسی انتہائی خفیہ مقام کا انتخاب کرو۔ تم اس قسم کے مقامات سے مجھ سے زیادہ آگاہ ہو۔"

"پھر...؟" فواد نے بے تابی سے سوال کیا۔

"پھر اس زمرد کو اس مقام پر چھپا کر کسی کاغذ پر بذریعہ تحریر اس مقام کی نشان دہی کردو تاکہ اس کے دوبارہ حصول میں آسانی ہو۔"

فواد کے دماغ میں کسی خیال نے رینگنے کی کوشش کی، لیکن اس نے اسے فوراً دھتکار دیا۔

"ٹھیک ہے۔ سمجھ گیا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "لیکن ایسا کیوں؟"

"کیا تم اس منحوس پتھر کو اب بھی ہر جگہ اپنے ساتھ لیے پھرنا پسند کرو گے؟"

"نہیں...!" فواد نے گھبرا کر کہا۔ "میں اس سے جلد از جلد...!"

"تو پھر فوراً ہدایات پر عمل کرو۔" آواز نے کڑک کر حکم دیا۔

"جی ہاں، جناب۔" فواد بولا۔

"اپنی تحریری ہدایت کے ساتھ ہوٹل نوروز میں میرے کمرے میں پہنچو۔ میں تمہیں رقم ادا کردوں گا۔"

"میں ہوٹل کب پہنچوں؟" فواد نے پوچھا۔

"میں رات گئے ہوٹل واپس آؤں گا۔" بھیانک آواز میں کہا گیا۔ "شاید آدھی رات تک میری واپسی ہو، لہٰذا میں استقبالیہ پر تمہاری آمد سے متعلق تحریری ہدایت چھوڑ جاؤں گا تاکہ تم میرے کمرے میں میرا انتظار کرسکو۔"

○

"آدھی رات۔" فواد کے لب کپکپا کر رہ گئے۔

"ہاں... آدھی رات۔" آواز نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"ٹھ... ٹھیک ہے۔" فواد ہکلا کر رہ گیا۔

"تو پھر اپنی کارروائی کا آغاز کرو۔" آواز نے حکم دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔ فواد نے اپنے لرزتے ہاتھ سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور بستر پر گر گیا۔

○

پراسرار آواز کے کمرے کی ہولناکی اور ویرانی دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے آج تک کسی انسان نے اس کے اندر قدم نہ رکھا ہو۔ اس کے در و دیوار تک سے وحشت ٹپک رہی تھی اور یہ احساس اتنا شدید تھا کہ فواد کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کمرہ گرد سے اٹا ہوا تھا لیکن کمرے میں ایک سوٹ کیس اور بستر کی موجودگی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ فواد سے قبل بھی کسی کے قدم یہاں تک آچکے ہیں۔ بستر پر ایک کھلی ہوئی کتاب پڑی تھی۔

فواد نے سوٹ کیس اٹھا کر ہلایا اور اس کا قفل کھول دیا۔ سوٹ کیس کے اندر حیرت انگیز چیزیں تھیں۔ یعنی آدھی درجن کتابیں اور متعدد تولیے۔ فواد نے کتابوں کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ یہ مختلف ہوٹلوں کی ٹیلی فون ڈائریکٹریاں تھیں۔

"حیرت ہے!" فواد حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے بستر پر رکھی کتاب کی طرف مڑا اور کتاب اٹھا کر دیکھی۔ عنوان تھا___ قتل کرنے کے طریقے___ دوسرے ہی لمحے اس نے تڑپ کر کتاب یوں چھوڑ دی، گویا غلطی سے دہکتا ہوا انگارہ ہاتھ میں لے لیا ہو۔ اُسے قتل وغیرہ جیسے بے رحم موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ کھڑکی خاصی نیچی تھی اور اس میں سلاخیں وغیرہ بھی نہیں لگی تھیں۔ اس نے نیچے تاریک سڑک پر نظریں دوڑائیں تو اسے سفید ٹوپی پہنے ہوئے

اسد بے تابی سے ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ سڑک پر اس کے علاوہ کوئی دوسرا متنفّس نہیں تھا۔ رات قریباً آدھی گزر چکی تھی اور چاروں طرف گہرے سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔

O

فواد نے رات بارہ بجے سے قبل ہی آواز کے احکامات کی تعمیل کر دی تھی۔ اس نے زمرّد ایک لاکر میں رکھ دیا تھا اور بڑی احتیاط سے اس تک پہنچنے کی ہدایت ایک کاغذ پر درج کر کے کاغذ چابی سمیت ایک لفافے میں ڈال کر اپنے پاس رکھ لیا۔

وہ بارہ بج کر بیس منٹ پر ہوٹل نوروز کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اسد شروع سے اس کے تعاقب میں تھا۔ احمق نے سفید ٹوپی پہن رکھی تھی جو کہ دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔

ہوٹل نوروز پہنچ کر اس نے استقبالیہ کلرک کو اپنا نام بتایا اور کہا: "ایک صاحب یہاں میرے منتظر ہیں۔"

کلرک بولا: "آقائے سلطان جلاّد آپ کے لیے ایک پیغام چھوڑ گئے ہیں۔ یہ رہی ان کے کمرے کی چابی۔ آپ کمرہ نمبر سات، تیرہ میں ان کا انتظار کریں۔"

"سات، تیرہ"۔ فواد چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ دونوں روایتی منحوس عدد تھے۔ وہ خاصا بدمزہ ہو کر رہ گیا۔ وہ اس سودے پر لعنت بھیجتا ہوا وہاں سے نو دو گیارہ ہونے کا فیصلہ کر کے مڑا ہی تھا کہ اس کی نظر اسد پر پڑی جو دروازے میں کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فواد دانت پیستا ہوا مڑا اور متحرک زینے کے ذریعے کمرہ نمبر سات، تیرہ کی طرف روانہ ہوا۔

O

اب وہ کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا سڑک کا جائزہ لے رہا تھا اور اسد پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

اچانک کسی نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ یک بارگی اچھل پڑا۔ اس نے نہ دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی، نہ کسی کے قدموں کی آہٹ اور نہ کوئی انسانی آواز، وہ مڑ کر اس شخص کو بغور دیکھنے لگا۔

فواد نے اس شخص کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ اے کاش وہ ہوٹل نوروز کے کمرہ نمبر سات، تیرہ میں نہ آیا ہوتا۔ اس کے سامنے جو شخص کھڑا تھا، وہ اس سے ایک ہاتھ اونچا تھا۔ اور اس کی شکل ... فواد کو یوں لگا کہ وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہو جائے گا۔ اس کی شکل اتنی بھیانک اور ہیبت ناک تھی کہ اس پر نگاہ پڑتے ہی فواد کی سانس سینے ہی میں اٹک گئی۔ اس کے سارے چہرے پر لمبی لمبی آڑھی ترچھی خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ جیسے گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کو انسانی شکل میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کی گئی ہو، اور آنکھیں ... اُف ... اگر یہ واقعی آنکھیں ہی تھیں تو فواد نے ساری زندگی میں اتنی خوفناک اور ڈراؤنی آنکھیں آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ بلاشبہ وہ دہکتے ہوئے دو انگارے تھے، جنھیں نہ جانے کس طرح ان بوٹیوں میں پیوست کیا گیا تھا۔ فواد کا دل ڈوب رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ عین اسی لمحے اس شخص کی حد درجہ خوفناک آواز اس کی سماعت کے پردے کو چیر گئی۔

"کیا تم نے میری ہدایات کے مطابق عمل کیا؟" وہ آواز فون پر سنائی دینے والی آواز سے کئی سوگنا دہشت ناک تھی۔ فواد نے اپنی غیر ہوتی حالت پر بڑی مشکل سے قابو پانے کی کوشش کی۔

"ج ... جی ہاں، جناب۔"

"اور تم نے کاغذ پر اس تک پہنچنے کی ہدایت تحریر کر دی؟"

"ج ... جی جناب ..." فواد اپنے لرزتے ہاتھ سے لفافہ اپنی جیب سے نکالتے ہوئے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"خوب۔ پھر اب تمہیں کس بات کا انتظار ہے؟" وہ غرّایا۔ اس کی غراہٹ کے سامنے شیر کی غراہٹ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ "لاؤ مجھے دو۔" اس نے اپنی شعلہ بار آنکھوں سے فواد کو گھورتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ فواد نے لفافے کو اپنی انگلیوں کے شکنجے میں کس لیا۔

"پ ... پپ ... پیسے؟" فواد نے کہا۔

"پیسے؟ کیسے پیسے؟"

"وہ ... د ... دد ... دس ہزار دو ... روپے ... ج ... جو آپ نے دینے کا د ... و ... وعدہ کیا تھا۔"

اس بھیانک شخص نے ایک ہیبت ناک قہقہہ لگایا اور فواد کا جی بے اختیار چاہا کہ کاش اس کے کان یہ روح فرسا قہقہہ سننے سے پہلے ہی بہرے ہو چکے ہوتے۔

"دس ہزار" وہ چہکا۔ "میں نے تو مذاق کیا تھا۔" اس نے کہا اور فواد کے دماغ میں چنگاریاں بھر گئیں۔

"کم از کم دس ہزار والے معاملے کو تو میں نہیں چھوڑ سکتا۔" فواد نے ٹھوس لہجے میں کہا اور اپنی اس جرأت پہ ایک لمحے کے لیے حیرت زدہ رہ گیا۔

"لفافہ ادھر لاؤ۔" جیسے بجلیاں کڑکیں... فواد نے پیچھے ہٹ کر لفافہ اپنے پیچھے چھپا لیا۔

"مجھے رقم دکھاؤ۔" فواد چیخا۔ "پہلے مجھے رقم دکھاؤ، پھر میں تم کو لفافہ دوں گا۔"

اچانک اس شخص نے اپنا دایاں ہاتھ دراز کیا اور پنجے کی انگلیاں پھیلا کر فواد کی جانب بڑھنے لگا۔ انگلیوں کے ناخن خوفناک حد تک لمبے تھے۔

"نہیں..." فواد کے منہ سے ایک دہشت ناک چیخ نکل گئی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا۔ اس کا جسم کھلی کھڑکی کے عقب میں بالکونی کے کٹہرے سے ٹکرایا اور دوسرے ہی لمحے اُلٹ کر تاریک فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا پختہ سڑک سے جا ٹکرایا۔

O

وہ بھیانک شخص بالکونی پر کھڑا نیچے نیم تاریک سڑک کو گھور رہا تھا۔

"بالکل پہلے کی طرح۔" وہ مدھم لہجے میں بڑبڑایا۔ "بالکل پہلے کی طرح۔" فواد کا جسم اس کی نگاہوں کے سامنے سڑک پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور وہ لفافہ اب بھی اس کی سرد مُٹھی میں دبا ہوا تھا... پھر اس نے سفید ٹوپی والے ایک شخص کو کسی تاریک گوشے سے نکل کر دبے پاؤں لاش کی جانب بڑھتے اور لفافے کو اس کے ہاتھ سے اُچک کر تاریکی میں گم ہوتے ہوئے دیکھا۔

"اور اب پھر اُسی طرح۔" اس دفعہ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ "یہ شخص بھی طاغوتی طاقتوں کا شکار ہو جائے گا..."

سب سے عظیم: خُدا کا سب سے عظیم نام اللہ ہے —
دُنیا میں سب سے عظیم شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں —

ڈیر انکل اشتیاق احمد، السلام علیکم! جون ۹۰ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ دو باتیں پڑھیں اور سسپنس سے بُرا حال ہو گیا۔ جانے کون سے رسالے ہیں وہ؟ خیر انکل چھوڑیے، آپ کو کیا؟ اپنا کام کرتے جائیے۔ اس طرح کی کالی بھیڑیں ہر قوم اور مُلک میں پائی جاتی ہیں۔ بدی ہر جگہ نیکی کے مقابل آتی ہے، مگر منہ کی کھا کر کافور ہو جاتی ہے —

یاسمین رحمت، طارق بن زیاد کالونی، ساہیوال

ڈیر انکل اشتیاق احمد، السلام علیکم! جون ۹۰ء کا چاند ستارے اور دونوں ناول پڑھے، بے حد پسند آئے۔ آپ کی اُنگلی کا پڑھ کر بے حد افسوس ہوا کہ اس میں پھر تکلیف شروع ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اُنگلی کو جلد از جلد صحت یاب کرے، تاکہ آپ ہمارے لیے اسی طرح اچھے اچھے ناول لکھتے رہیں اور چاند ستارے اسی طرح شان و شوکت سے شائع ہوتا رہے اور بچّوں کو حقیقی معنوں میں با مقصد اور معیاری ادب پڑھنے کو ملتا رہے۔ آمین!

محمد یونس، کامران بک سٹال، کیماڑی، کراچی نمبر ۲

ڈیر انکل اشتیاق، آداب! میں آپ کو ایک عدد لطیفہ اور دو سوال بھیج رہی ہوں، اگر پسند آئیں تو شائع کریں، ورنہ ہمارا مقدر

تو ردی کی ٹوکری ہے۔ ہماری قریباً ایک درجن تحریریں یہ ٹوکری کھا گئی۔ بے حد بھوک کی ہوتی جا رہی ہے۔ پتا نہیں، آپ اسے بھوک لگنے کی کون سی دوا دیتے ہیں۔ ویسے چاند ستارے آسمان پر پائے جاتے ہیں اور آپ کا چاند ستارے بھی آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش میں کامیاب ہو چکا ہے۔

صدف اجمل، محمد اجمل، لارنس کالج، مری

انکل اشتیاق احمد، السلام علیکم! اس ماہ کا چاند ستارے پڑھا۔ ایک آیت ایک حدیث پڑھ کر علم دینی میں اضافہ ہوا۔ دو باتیں کا آخری پیراگراف سمجھ میں نہیں آیا۔ ماہ جولائی کا شمارہ شائع نہ کر کے آپ نے اچھا نہیں کیا۔ بیگار مشن چربہ ناول محسوس ہوا، اس میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔

ابن بدر انجم انصاری، اورنگی ٹاؤن نمبر ۱۱، الصدف کالونی، مدنی مسجد، مدنی چوک، ایوب زری ہاؤس کراچی نمبر ۳۱

محترم اشتیاق احمد، السلام علیکم! چاند ستارے پوری آب و تاب کے ساتھ روشنی بکھیرتا ہوا جلوہ افروز ہوا، مگر اس مرتبہ بھی بہاول نگر سے لکھنے والوں کی تحریریں چاند ستارے میں نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ ویسے اس مرتبہ تمام کہانیاں اور مستقل سلسلے بہت اچھے تھے۔

محمد حنیف وقار، نادر شاہ بازار، بہاول نگر

اشتیاق احمد، آداب! جون کا چاند ستارے میری امید پر پورا نہیں اترا۔ سرورق تو بالکل جاذب نظر نہیں تھا، توجہ دیا کریں۔ کاغذ بھی بے حد خراب اور کھردرا تھا۔ کہانیوں کا انتخاب بھی اتنا اچھا نہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس ماہ چاند ستارے نے بور ہی کر دیا۔ لکھائی بھی بے حد خراب تھی۔ الفاظ بے حد چھوٹے تھے۔ اس ماہ تو چاند ستارے اپنی روایتی شان و شوکت کھو بیٹھا تھا۔ تصاویر بھی اچھی نہ تھیں۔ صرف گم شدہ جزیرے کی قسط ذرا اچھی تھی۔ یقیناً آپ کو یہ خط برا لگا ہوگا۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہی لگتا ہے۔

مسرور احمد، مکان نمبر ۱۲، گلی نمبر ۲۹، ۶/۲ جی، اسلام آباد

ڈیر انکل، السلام علیکم! جون کا چاند ستارے ۲۶ مئی کو ملا۔ ہم چاند ستارے کے پرستار ہیں۔ جب بھی بک سٹال پر جائیں تو دکان دار کا ٹھینگا ہمارا منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ ہمارا

محبوب پرچہ چاند ستارے بک سٹال سے اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اس ماہ کا چاند ستارے پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام تحریریں معیاری تھیں۔ سرورق نہایت خوب صورت تھا۔

عامر اقبال خانزادہ، سی۔ اے۔ ہم ماشاء اللہ مارکیٹ ڈرگ کالونی نمبر ۲، الفلاح سوسائٹی، کراچی ۲۵

انصاف کے قاتل اشتیاق احمد، السلام علیکم! گم شدہ جزیرہ کی دو باتیں پڑھ کر معلوم ہوا کہ انگلی کے درد کی وجہ سے آپ چاند ستارے بند کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی، اللہ کا شکر ادا کیا کہ چند افراد کے لیے مخصوص اس رسالے سے میری اور میرے محلے کے اکتالیس بچوں کی جان چھوٹ جائے گی۔ ابھی تو میں صرف ایک محلے کی بات کر رہا ہوں، اگر سروے کرایا جائے تو آپ کو اپنی اور اپنے رسالے کی مقبولیت کا خوب اندازہ ہو جائے گا۔ آپ اپنے ناولوں میں اسلام کے علم بردار بنے پھرتے ہیں، لیکن چاند ستارے میں آپ اسلام کے اصولوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ ناولوں میں مساوات کا سبق دیتے ہیں، لیکن چاند ستارے میں عام قارئین (دس سے پندرہ سال کے بچوں) سے بالکل انصاف نہیں ہوتا۔ رسالے پر ایک مخصوص ٹولے کی اجارہ داری قائم ہے۔ اس ٹولے سے مراد سعید مختار، انجم شمیم، سرمد ایوب، خرم مختار، طاہر مسعود ملک، عالیہ ناز اور نبیلہ ناز وغیرہ ہیں۔ سعید مختار، انجم شمیم اور سرمد ایوب اس ٹولے کے سربراہ ہیں۔ ان تینوں کی ہر مہینے کوئی نہ کوئی کہانی نہ چھپے، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی افراد کی تحریریں ون بائی ون کے اصول پر چھپتی ہیں۔ ان افراد کی کہانیاں چھاپنے کے بعد جو صفحات بچ جاتے ہیں، ان میں چند عام قارئین کی کہانیاں چھاپ کر یہ ڈھنڈورا پیٹ دیا جاتا ہے کہ یہ رسالہ تو آپ کا اپنا ہے۔ ہم جیسے قارئین منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آپ کے قول و فعل میں بالکل سیاست دانوں کی طرح تضاد ہے۔ میرا مشورہ ہے، آپ سیاست دان بن جائیں۔

اس خط کو رسالے میں ضرور شائع کیجیے گا، لیکن نہیں، آپ اپنا پول اپنے ہاتھوں سے کیسے کھول سکتے ہیں، اگر یہ خط رسالے میں چھپ جائے تو آپ تو گئے کام سے۔ اب تو راہ راست پر آ جائیں اور سب سے مساوی سلوک روا رکھیں۔

علی فرہاد حمید، ۳۱۱ کامران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ڈیر اشتیاق احمد، السلام علیکم! جون ۹۰ء کا چاند ستارے کوئی خاص تاثر نہیں دے سکا۔ صرف گم شدہ جزیرہ، جیسی کرنی، بیگار مشن اور سعید مختار کا بھٹکتے مسافر اچھی تحریریں تھیں۔

عبدالمنان خرم بٹ، الریاض ۶۹۰۲، السعودیہ

خالو جان، السلام علیکم! پہلی مرتبہ چاند ستارے پڑھا، بہت مزہ آیا۔ یہ بہت خوب صورت اور معیاری رسالہ ہے۔ ایک آیت ایک حدیث، حمد اور نعت کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔

فرزانہ ریاض، میلسی

محترم اشتیاق احمد، السلام علیکم! اپنے عزیز کے ہاں ماہنامہ چاند ستارے دیکھا، گمان یہ کیا کہ شاید اس رسالے میں علمِ نجوم کے بارے میں معلومات ہوں گی، کیونکہ نام ہی کچھ اس قسم کا ہے۔ جب اس کا مطالعہ کیا تو قلبی مسرت ہوئی۔ اس رسالے نے ہر خاص و عام کو چاند جیسی روشن نصیحتیں اور ستاروں جیسی اَن گنت معلومات فراہم کی ہیں۔ اُمید قوی ہے کہ ان شاء اللہ یہ رسالہ ظلم کی سیاہ کاریوں کی کالی رات میں چاند کی طرح روشنی پہنچا کر انسانیت کی قدر و منزلت سے آگاہ کرے گا اور جہالت کی اندھیری گھپ رات میں ستاروں کی طرح، بھٹکے ہوئے لوگوں کی راہنمائی کرے گا۔

غلام رسول متعلم، مکان نمبر ۱-۱۷، ای، بھیانی ہائیٹس بلاک نمبر ۱۴، گلشن اقبال، کراچی نمبر ۴۷

انکل اشتیاق احمد، السلام علیکم! جون کا شمارہ پڑھا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند باتیں اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں تحریر شدہ مواد بہت ہی پسند آیا۔ تمام رسالے اگر چاند ستارے کی طرح کا مواد شائع کرنا شروع کر دیں تو بہت جلد ہمارے ملک سے بُرائی کا نام و نشان مٹ جائے۔

محمد ندیم نعیم، حسن دین سبزی فروش، گوجرہ بازار، شورکوٹ کینٹ

ڈیر انکل اشتیاق، السلام علیکم! اس مرتبہ جون کے چاند ستارے نے تو شکل دکھانے میں بہت تاخیر کی، لیکن جونہی اسے دیکھا سارے گلے شکوے دُور ہو گئے۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ ایک آیت ایک حدیث پڑھ کر دل و دماغ اور روح کو تازگی ملی۔ رسالہ بہت اچھا تھا۔

محمد عمران ۷/۷ زیڈ، نیا شہر، جھنگ

اچانک ایک آہٹ پر دونوں چونک اٹھے۔
"چھت پر کوئی ہے۔" علی نے لحاف سے منہ نکال کر کہا۔
"کوئی دھم سے کودا ہے۔" خالد نے بھی لحاف سرکایا۔
"دیکھنا چاہیے۔"
"سردی بہت ہے، ایسا کرو تم بھاگ کر دیکھ آؤ، اگر کوئی چور وغیرہ ہوا اور صفایا کر کے چلتا بنا تو بہت شرمندہ ہونا پڑے گا۔" علی نے کہا۔
"ابا جان وغیرہ بھی اب تک شادی سے لوٹ کر نہیں آئے، عائشہ مذاق اڑائے گی، اگر چوری ہو گئی تو۔ تم ایسا کرو کہ اوپر ایک نظر ڈال آؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی بلی وغیرہ کودی ہو۔"
"سو جاؤ یار، بلی وغیرہ ہی ہوگی۔" علی نے لحاف میں منہ دیتے ہوئے کہا۔
"بہت سست ہو۔" خالد نے بھنا کر کہا۔
"تم خود جا کر دیکھ آؤ۔" علی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔
"تمہارے پاؤں گھس جائیں گے۔" خالد نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"بس ٹھیک ہے، آدھے تو تم لحاف سے نکل ہی آئے ہو، اب مہربانی فرما کر پورے نکل آؤ، جوتیاں پہنو اور سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے اوپر چھت پر اور دائیں بائیں ایک نظر ڈال کر واپس آجاؤ، اور ہاں اگر کوئی چور یا ڈاکو ہو تو مجھے آواز دے لینا۔"
"تم کیا کرو گے۔"
"بچاؤں گا تمہیں چور سے۔"
"اللہ مالک ہے۔" خالد نے چارپائی سے پاؤں نیچے لٹکاتے ہوئے کہا۔
"تم جیسا بزدل آدمی میں نے نہیں دیکھا۔" علی نے اسے چڑایا۔

"میں کس طرح بزدل ہو گیا، میں تو چور کو دیکھنے کے لیے چھت پر جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ بزدل تو تم ہو جو لحاف میں دبکے پڑے ہو۔"
"اتنے ہی بہادر ہو تو جا کر دیکھ آؤ۔" علی نے اسے مزید بھڑکایا۔
"جا رہا ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"اب کیوں رک گئے۔" علی نے اسے قدم نہ اٹھاتے دیکھ کر کہا۔
"میری جیکٹ کہاں ہے۔"
"بغیر جیکٹ کے نہیں جا سکتے۔" علی نے کہا۔
"تم چپ رہو۔" خالد نے اسے ڈانٹا۔
"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو جیکٹ کے بارے میں۔"
"اف۔ کیا بلا ہو تم۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔
وہ پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے نکلتے ہی علی تیزی سے اٹھا، جوتے پہنے اور جیکٹ اٹھاتے ہوئے کھڑکی کے ذریعے گھر سے باہر نکل گیا۔ گھر سے نکل کر اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دور پارک کے کنارے ایک کار کھڑی نظر آئی۔ وہ دبے قدموں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے چہرے پر چادر ڈالی ہوئی تھی۔ وہ جیکٹ بھی پہن چکا تھا۔ کار کے پاس پہنچ کر اس نے جھانکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی بیٹھا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر پچھلا دروازہ کھول کر تیزی سے بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو تھپکی دی۔ وہ ہوشیار ہو گیا۔ کار چل پڑی۔ اس کی ڈرائیونگ بڑی خطرناک تھی۔ رات کا وقت تھا اور سردی کا موسم تھا۔ سڑکیں دور دور تک سنسان پڑی تھیں۔ وہ خاموش بیٹھا رہا اور نہ ہی ڈرائیور نے کوئی بات کی۔ کار شہر سے باہر نکلی جا رہی تھی۔ ایک خطرناک موڑ مڑتے ہی ڈرائیور نے کار کو شہر سے بیس کلومیٹر دور کالے کھنڈرات کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ علی ایک لمحے کے لیے چونکا۔ ان کھنڈرات کے بارے میں بڑی عجیب و غریب کہانیاں کافی عرصے سے شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ طوفانی رفتار سے چلتے ہوئے وہ صرف تیرہ منٹ میں بیس کلومیٹر طے کر گئے۔ سردیوں کی پراسرار چاندنی میں نہائے ہوئے ہیبت ناک کالے کھنڈرات بڑے خوفناک اور آسیب زدہ سے نظر آ رہے تھے۔

اچانک ایک دل پھاڑ دینے والی چیخ سنائی دی۔ جگر ہلا دینے والی خوف و دہشت سے بھرپور چیخ۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل کانپا، مگر اس نے اپنے آپ کو مضبوط رکھا۔ کار ایک پرانے کھنڈر کے اندر اس انداز میں جا کر رکی جیسے گیراج ہو۔

"کام ہو گیا شوفو۔ لے آئے فائل ۳ کو۔"

"خبردار! تم میرے نشانے پر ہو، نیچے آ جاؤ۔" علی نے غراتے ہوئے اس شخص سے کہا جو کھنڈر کی ایک دیوار پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"کک... کون ہو تم؟" ڈرائیور خوف زدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹا۔

"انسپکٹر عمر کا فرزند، علی۔"

"اوہ! شوفو کہاں ہے؟" اس شخص نے اترتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں، شاید فائل ۳ کو تلاش کر رہا ہو گا۔"

"جھونگاس۔ کیا تم اندھے ہو گئے ہو؟" اترنے والے شخص نے ڈرائیور سے کہا۔

"باس۔ اندھیرا تھا، میں نے غور نہ کیا۔ میں تو یہی سمجھا کہ شوفو فائل لے آیا ہے۔"

"تم فائل ۳ کے چکر میں کیوں ہو؟۔ کون ہو تم؟"

"فائل ۳ کی اہمیت کو میں نہیں جانتا، تم ضرور جانتے ہو۔"

"میں تو واقعی جانتا ہوں۔" علی نے مزید اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اور میں جاننا چاہتا ہوں۔" باس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے ہاتھ میں پستول ہے، کوئی گاجر مولی نہیں کہ مسکرائے ہی جا رہے ہو۔ خبردار!"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ یہ لو۔" علی نے جیکٹ کی جیب سے رسی کا گولا نکالا۔

"کیا کروں؟" باس نے گولا دبوچتے ہوئے پوچھا۔

"جھونگاس کو دو۔ یہ تمہیں اپنے پیارے پیارے اخروٹ جیسے ہاتھوں سے باندھے گا۔"

"میں یہ کام نہیں کروں گا۔" جھونگاس نے انکار کیا۔

"تو کیا پھر تم گدھا گاڑی چلاؤ گے جو یہ کام نہیں کرو گے۔ بڑے آئے نواب کہیں کے۔

چلو باندھو اپنے باس کو ورنہ میرے پستول سے چھے میں سے کوئی ایک گولی ناراض ہو کر نکل ہی آئے گی اور تمہیں کاٹ کھائے گی۔"

"گولی ہے یا کوئی سانپ۔" باس نے مذاق اڑایا۔

"باس ہو کر مذاق کرتے ہو، شرم نہیں آتی تمہیں۔ کیسے غیر سنجیدہ باس ہو تم۔"

"مجھے باندھ دو۔" اچانک باس نے جھونگاس سے کہا۔

"باس۔ آپ اس لڑکے سے ڈر رہے ہیں؟" اس نے کہا۔

"تم بھی ڈرنا شروع کر دو، گھاس۔" علی بولا۔

"گھاس نہیں جھونگاس۔" وہ غصے میں آ گیا۔

"رشتے دار لگتا ہے گھاس کا تمہارا یہ نام، جھونگاس۔" علی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ گولی چلا دے گا بے وقوف۔ مجھے باندھ دو۔" باس نے جھونگاس کو حکم دیا۔

"باندھ دیتا ہوں باس، پھر نہ کہنا۔"

"پھر یہ کیا کہے گا۔ پھر تو کہنے کے لمحات میرے آئیں گے۔" علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیوتا بھلی کرے، شوفو فائل لے آئے۔" باس نے رونے والے انداز میں کہا۔

"ہائیں! کیا تم ہندو ہو؟"

"ہاں۔ میں، یہ اور شوفو ہندو ہیں ـــ شوفو میرا بھائی ہے اور یہ میرا ماتحت ہے۔" باس کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بول پڑا۔

"کیا لوگ ہو تم! ان پتھر کے بتوں سے مانگتے ہو، جن کو خود اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو۔ کہاں ہے تمہارا دیوتا؟" علی نے پوچھا۔

"اندر۔" باس نے کہا۔

"کھنڈرات کے اندر؟" علی نے سوال کیا۔

"ہاں۔" باس نے کہا۔

اچانک پھر وہی ہولناک چیخ گونجی۔ علی کے ہاتھ سے مارے خوف کے پستول نکل گیا اور

وہ دونوں اس پر آ رہے ہے۔

"ہائیں! چھت پر تو کوئی بھی نہیں ہے، کیا مجھے وہم ہوا تھا؟" وہ بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر آیا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ چونکا۔ علی کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے باہر آ کر دیکھا، بیرونی دروازہ بند تھا۔ وہ پھر کمرے میں آیا اور بغور جائزہ لیا۔ کھلی کھڑکی دیکھ کر اور جیکٹ نہ پا کر وہ سمجھ گیا کہ علی اپنی مرضی سے باہر گیا ہے، اسے کسی نے اغوا نہ کیا۔ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ دوبارہ صحن میں آیا۔ تمام کمرے چیک کیے، سب باہر سے لاک تھے۔ اچانک ایک آہٹ نے اس کے کان کھڑے کر دیے۔ آہٹ کی سمت کا اندازہ لگا کر اس نے اس طرف دیکھا، آہٹ انسپکٹر عمر کے کمرے سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ جھپٹ کر اپنے والد کے کمرے کی طرف آیا۔ دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ بند تھا، تالے پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا، دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا اور بولا:

"میرے ہاتھ میں پستول ہے، سامنے سے ہٹ جاؤ، اگر رکاوٹ بننے کی کوشش کی، تو گولی چلا دوں گا۔"

"گولی ہی چلاؤ گے، اور کیا تیر چلاؤ گے؟" خالد نے مذاق اڑایا۔

"میں بہت بے رحم ہوں۔" اندر سے کہا گیا۔

"وہ تو جناب کی آواز ہی بتا رہی ہے۔" اس نے باہر سے دروازے کی چٹخنی لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔" خالد ہنسا۔

"دروازہ کھول دو، ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا۔"

"یہ کیا اٹھایا ہوا ہے؟" خالد نے تالے کے سوراخ میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"میرے مطلب کی چیز ہے۔"

"اوے! فف۔۔۔ فائل ۳ کو۔ او۔۔۔ تمہارا بیڑہ غرق۔ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یہی لینے آیا ہوں۔"

"غلط آئے تھے اور غلط چیز لے کر جانا چاہتے ہو۔"

"میں گرامر میں کمزور ہوں۔"

"تو پھر کس چیز میں طاقت ور ہو؟"

"لڑنے بھڑنے میں۔ تم مقابلہ کر کے دیکھ لو، تم میرے بائیں ہاتھ کی مار ہو۔" اس نے اکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے تو پھر آ جاؤ، ہو جائیں دو دو ہاتھ۔" خالد نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"دروازہ کھولو۔"

"پہلے فائل سیف میں رکھ دو۔"

"میرے ایک ہاتھ میں فائل رہے گی اور دوسرے میں پستول۔"

"مقابلہ کیسے کرو گے، کیا تم کوئی فلمی اداکار ہو؟"

"یہ میرا کام ہے میں بہتر جانتا ہوں۔ میں ٹانگوں سے اور سر سے لڑوں گا۔"

"اچھا تو تم میاں بھینسے کے رشتے دار ہو یا پھر تمہارا تعلق گینڈے وغیرہ سے رہا ہو گا۔"

"تم باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"ٹھہرو! ذرا میں ایک فون کر آؤں۔"

"جلدی آ جانا۔ بند کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"سردی کا موسم ہے، عجیب بے وقوف دم ہے تمہارا جو اس بلا کی سردی میں گھٹ رہا ہے۔ گرمی میں تمہارا کیا حال ہوتا ہو گا۔"

"بس میں ہی جانتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

خالد تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ ریسیور اٹھا کر اس نے ایک بٹن دبا کر اپنے والد کے فون کا کنکشن بند کیا اور نمبر ڈائل کیے۔ رات کا وقت تھا۔ بھلا اتنی جلدی کون ریسیور اٹھاتا۔ چار منٹ کے طویل انتظار کے بعد سب انسپکٹر کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"انکل! فائل ۳ کو۔۔۔"

"کیا!" اس کی ساری نیند رفوچکر ہو گئی۔

"کیا ہوا ہے فائل کو؟" سب انسپکٹر حسن نے بے قراری کے عالم میں پوچھا۔

"مجرم کے پاس خیریت سے ہے اور مجرم کمرے میں بند ہے، باہر میں تشریف فرما ہوں۔ علی غائب ہے، میں حاضر ہوں۔"

"میں آ رہا ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

ریسیور رکھ کر وہ صحن میں آیا، اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ دبے قدموں چلتے ہوئے وہ دروازے تک آیا اور بغیر آواز کے دروازہ کھول دیا، لاک کھلتے ہی دروازے کے پٹ جدا ہوئے اور دو بھاری جسم اندر صحن میں آ کر گرے۔ ان کی پھرتی اور چالاکی پر خالد حیران رہ گیا۔ دونوں آنے والے حضرات پستولوں سمیت ایکشن سے اُٹھ رہے تھے۔

"کیا گر گئے ہو؟" اندر سے پوچھا گیا۔

"شوفو۔ تم اندر ہو؟" آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"بھائی جان۔ آپ آ گئے؟ اچھا ہوا۔ جلدی کیجیے۔ انسپکٹر عمر کا بیٹا فون کرنے گیا ہے۔"

"یہ ہمارے سامنے کھڑا ہے۔" باس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"ارے! جھونکاس تم۔ تم اندر کیوں آئے؟" شوفو نے بگڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کھنڈرات تک ہو آیا ہے، تمہارے بغیر۔"

"کیا مطلب؟"

"نکل چلو۔ مطلب باہر چل کر پوچھ لینا۔"

"کھنڈرات۔" خالد کے منہ سے نکلا۔

"اوہ! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس کے سامنے کھنڈرات کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔" باس بولا۔

"اسے بھی ساتھ لیے چلتے ہیں۔" جھونکاس نے کہا۔

"چلو بھئی تمہیں بھی وہیں لے چلیں، جہاں تمہارا بھائی ہے۔"

"اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو گی، بہت دن ہو گئے ہیں بھائی سے ملے ہوئے۔"

"باہر نکلو۔" باس نے پستول سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں جوتی بدل لوں ذرا؟"

"نہیں۔ اسی حالت میں چلو۔"

وہ باہر نکل کر ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ جھونکاس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور شوفو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار چل پڑی۔ انسپکٹر عمر کے گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا پڑا رہ گیا۔

"مسٹر باس۔ کیا تم اپنے چہرے سے نقاب نہیں ہٹاؤ گے؟ تمہارے یہ دونوں ساتھی تو بے نقاب ہیں۔"

"یہ میک اپ میں ہیں۔ رہا میرا چہرہ، وہ بہت خاص ہے، دیکھ کر مارے حیرت کے مر جاؤ گے۔"

ان کو گئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک جیپ ان کی گلی میں داخل ہوئی.... سب انسپکٹر چھلانگ مار کر نیچے اترا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر وہ چونکا۔ جلدی سے اندر داخل ہوا اور بلا کی پھرتی سے باہر آ گیا۔

"کھنڈرات والی سڑک پر چلو۔" سب انسپکٹر حسن معاویہ نے ڈرائیور سے کہا۔

"سر۔ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ مجرم فرار ہو چکا ہے اور کس سمت گیا ہے؟"... سادہ لباس والوں میں سے ایک نے سوال کیا۔

"عقل کے ذریعے بہت سے پیچیدہ مسائل منٹوں میں حل ہو جاتے ہیں۔" حسن معاویہ مسکرایا۔

"آپ نے بتایا نہیں سر؟"

"آج کل تمام سڑکیں از سرِ نو تعمیر ہو رہی ہیں۔ صرف دو سڑکیں ایسی ہیں جو اس طرف آتی ہیں یعنی ان پر ابھی کام شروع نہیں ہوا۔ ایک سڑک وہ جس پر سے ہم آ رہے ہیں۔ اگر مجرم اس طرف سے فرار ہوتا تو ظاہر ہے ٹکراؤ ہوتا اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ کھنڈرات والی سڑک پر گیا ہے۔ رات کے شروع میں ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے سڑکیں گیلی ہیں۔

کار کے تازہ نشانات بھی کھنڈرات والی سڑک کی طرف جا رہے ہیں۔"

"آپ بہت تیز ہیں سر۔" ایک ماتحت نے کہا۔

"رفتار بڑھا دو بھئی، سامنے دیکھو۔" حسن صاحب نے ڈرائیور سے کہا۔

"وہ رہی کار۔" ڈرائیور کے منہ سے نکلا۔

"کیا اس کار میں مجرم ہی ہے؟"۔ ایک ماتحت بولا۔

"مجرم کے علاوہ خالد بھی ہے۔ ارے! رک جاؤ بریک لگاؤ۔" اچانک حسن معاویہ کی نظر ایک چیز پر پڑی۔

"یہ کیا بھئی۔ شاید کوئی گڑبڑ ہے۔" انسپکٹر عمر نے گھر کے سامنے بریک لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ دونوں احمق دروازے کھلے چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟" عائشہ نے اترتے ہوئے کہا۔

"تمام پڑوسیوں کی لائٹیں بند ہیں، اس کا مطلب ہے کہ کسی کو کچھ پتا نہیں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"

عائشہ محتاط انداز میں اندر داخل ہوئی۔ صحن کی لائٹ جل رہی تھی۔ انسپکٹر عمر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ کھلے سیف پر نظر پڑتے ہی وہ جلدی سے آگے بڑھے۔ ایک ہی نظر میں انہوں نے جان لیا کہ "فائل بھئی" تو غائب ہے۔ انہوں نے جلدی جلدی خالد اور علی کے کمرے کو دیکھا اور نتیجہ اخذ کیا۔ اچانک ان کی نظر صحن کے ایک کونے میں پڑی ہوئی سنہری رنگ کی ایک چیز پر پڑی۔ وہ اس کی طرف لپکے اور گھٹنوں کے بل جھک کر اس چیز کو دیکھا۔ اگلا لمحہ ان کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ عائشہ نے بھی اس چیز کی جانب دیکھا۔ وہ بھی بری طرح چونک اٹھی۔ دونوں نے حیرت کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بیگم عمر ایک کونے میں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انسپکٹر عمر باہر آئے اور جیپ اندر لائے۔ جیپ میں لگے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ رات کا وقت تھا۔ کافی دیر بعد سلسلہ ملا۔ انہوں نے چند ہدایات دیں اور ریسیور رکھ دیا۔ انہوں نے بیگم کو دروازہ بند کرنے کے لیے کہا اور خود پورے گھر کا جائزہ لیا۔

"ان دونوں کو فائل سمیت لے جایا گیا ہے یا وہ ان کے تعاقب میں ہوں گے۔"

"ابا جان۔ آپ کو اُدھر فون کرنا چاہیے۔"

"اوہ! ہاں۔" انہوں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کیے۔

"ہیلو!" بہت دیر بعد نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔

"شام کے وقت نکلے تھے، اب تک لوٹ کر نہیں آئے۔"

"ہوں۔ جب کبھی وہ رات گئے تک نہیں لوٹتے یا دیر سے آتے ہیں تو یہ وقت وہ کہاں گزارتے ہیں؟"

"خیریت تو ہے جناب؟"

"خیریت ہی سمجھو۔ مجھے ان سے ضروری ملاقات کرنی ہے، ملکی نوعیت کا کام ہے۔"

"پھر آپ ایسا کریں، بلیو وائٹ کلب چلے جائیں۔" ملازم نے بتایا۔

"شکریہ!" انہوں نے ریسیور رکھ کر وقت نوٹ کیا۔

"آپ کلب جا رہے ہیں؟" عائشہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ فنگر پرنٹ عملے کے آنے تک تم اس چیز کے پاس رہو گی۔ اگر عملہ نہ آسکے یا اس کو رکاوٹ پیش آجائے یا کوئی بھی صورت ایسی بن جائے کہ ہر چیز قبضے سے نکلتی نظر آئے تو ایسی صورت حال میں تمہارا جو دل چاہے کرنا مگر اس چیز کو ہاتھ سے مت جانے دینا۔"

ان کی جیپ طوفانی رفتار سے کلب کی طرف جا رہی تھی۔ بارہ تیرہ منٹ کے بعد وہ ایک خوب صورت سڑک بلیو روڈ کی ایک حسین ترین عمارت کے سامنے رکے۔ ان کو دیکھ کر کلب کے پہرے دار، گیٹ کیپر چونک اٹھے۔ جیپ لاک کر کے وہ کلب کے دروازے کی طرف بڑھے۔ پہرے داروں نے ان کے لیے راستا چھوڑ دیا۔ اس کلب میں داخلہ کارڈ کے بغیر ممکن نہیں تھا، لیکن ان کو روکنے کی جرأت کوئی نہ کر سکا۔ وہ سیدھے کاؤنٹر پر آئے، ان کی نگاہیں چمکیں۔

"آپ! خیریت تو ہے؟" کاؤنٹر کلرک نے چونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک شخص سے ملنا ہے، سرکاری کام ہے۔" ادھر دیکھو۔" انہوں نے اپنی ہتھیلی اس

کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! وہ تو آج نہیں آئے۔"

"یہی بات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"بے شک آپ مینجر یا مالک سے مل لیں۔ اس وقت وہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں موجود ہیں۔"

"شکریہ!" وہ مالک کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

کلب کے مالک کا کمرہ نچلی منزل میں ایک کونے میں تھا۔ انہوں نے دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ عین اسی وقت پورے کلب کی لائٹ آف ہوگئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے چونکے۔ اچانک کسی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا۔ جونہی وہ اندر داخل ہوئے، لائٹ آن ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے کمرے میں موجود دو افراد بڑی بری طرح اچھلے۔ ان کے چہروں پر خوف دوڑ گیا۔

"شاید میں کسی اور کے وقت پر پہنچا ہوں۔ کسی اور نے اس وقت پروگرام کے مطابق آنا تھا۔ لائٹ آف ہونی تھی اور فائل ۳ کو تمہیں ملنا تھی، لیکن یہ معاملہ گڑبڑ ہوگیا۔" انسپکٹر عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ کہاں ہے؟" کلب کے مالک نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میری گرفت میں، میں تمہیں فائل ۳ کو اڑوانے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے، اس نے ہمارے بارے میں سب کچھ اُگل دیا ہے۔" مینجر نے کہا۔

"تم پوری طرح پھنس چکے ہو۔" انہوں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"فف... فائل کہاں ہے؟" مالک نے پوچھا۔

"میرے قبضے میں۔" انہوں نے پستول نکال کر ان کی طرف تانتے ہوئے کہا۔ ان کا دوسرا ہاتھ فون کی طرف بڑھ گیا۔

"ہیلو! کون صاحب؟" سلسلہ ملنے پر پوچھا گیا۔

"بلیو وائٹ کلب کو چاروں طرف سے گھیر لو۔" انہوں نے اپنا تعارف کرا کر حکم دیا۔

"اوکے سر۔" اُس طرف سے کہا گیا۔

"تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔" کلب کے مالک نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا تم ملک امریکا کے جاسوس ہو؟"

ان کے سوال پر وہ چپ ہو کر رہ گئے۔ وہ برابر ان دونوں پر پستول تانے رہے یہاں تک کہ بھاری قدموں کی آواز گونجی۔ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ سادہ لباس والے اندر داخل ہوئے۔ ان کے اشارے پر دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ بڑی تیزی سے کلب کی تلاشی لی گئی، لیکن کچھ برآمد نہ ہوا۔

"ان کو جیل لے جاؤ اور کلب خالی کرا دو۔" انسپکٹر عمر نے کہا۔

"سر۔ کلب میں تو بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں جن میں سرکاری آفیسر بھی ہیں۔" ایک سادہ لباس والے نے گھبرا کر کہا۔

"یہ لو۔" انہوں نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر دیا۔

"ٹھیک ہے سر۔"

چند ہی منٹوں میں اس کارڈ کے ذریعے سب لوگ کلب سے نکال دیے گئے۔ مالک اور مینجر کو جیل بھیج دیا گیا۔ انسپکٹر عمر نے اپنی تیز نگاہوں سے ایک کرسی پر بیٹھ کر مالک کے کمرے کی بغور تلاشی لی۔ ان کی نگاہیں میز پر جم گئیں۔ وہ تیزی سے اٹھے۔ میز کے چاروں کونوں کو چیک کیا، ایک کونے پر ذرا سا دباؤ بائیں سمت ڈالا، تو دائیں طرف ایک خلا سا نمودار ہوا۔ اس میں کاغذات موجود تھے۔ جن سے ثابت ہوگیا کہ یہ دونوں امریکا کے جاسوس تھے۔ کاغذات لے کر وہ جیل آئے۔ دونوں مجرموں کے سامنے کاغذات کرتے ہوئے انہوں نے نہایت ہی پراسرار انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ مجرم ان کی گہری مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھ سکے۔

"میرا بچھایا ہوا جال کامیاب رہا۔" وہ ہنسے۔

"کیا مطلب؟" دونوں چونکے۔

"بہت عرصے سے ہمارے ایک خاص محکمہ کے خفیہ راز چوری ہو رہے تھے، مجرم

ہمارے درمیان میں ہی تھا۔ اس کا سراغ لگانے کے لیے "فائل ۳ کو" کا چکر لگایا گیا۔ ایک سرکاری اجلاس میں ایک پروگرام بنایا گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ اسلامی دوست ملک (کو) کے صدرِ مملکت تین روزہ دورے پر ہمارے ملک آرہے ہیں۔ ان کی آمد اور روانگی کے بارے میں پروگرام بنایا گیا کہ ان کو کن راستوں سے لایا جائے گا اور کن راستوں سے واپس لے جایا جائے گا۔ حفاظتی بندوبست کا منصوبہ بنایا گیا جو کہ تحریری طور پر "فائل ۳ کو" بنا۔ بگ پاور امریکا ملک کو کے صدر کو اڑانے کے چکر میں بہت عرصہ سے ہے۔ جب اس کو بھنک پڑی کہ کو کا صدر پاک لینڈ آرہا ہے، تو اس نے تمہیں اشارہ کیا کہ فائل ۳ کو اڑالو۔ تم نے آگے اس شخص کے ذمہ لگایا جس کی تلاش ہمیں تھی۔ مجرم سامنے آگیا۔ اس وقت مجرم کے پاس میرے دونوں لڑکے ہیں۔ میں بہت جلد اس تک پہنچ جاؤں گا تمہارے ذریعے۔ یہ سب تو ڈرامہ تھا۔ کو کے صدر کو تو آنا ہی نہیں تھا۔" وہ طنزیہ مسکرائے۔

اچانک بریک لگنے سے جیپ الٹ گئی۔ سڑک پر ایک بم پڑا تھا۔ اسی وقت اگلی کار کی بریک لگی۔ شوفو اور جھونگاس نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ جو سادہ لباس والا الٹی ہوئی جیپ میں سے نکلا، اس کے سر پر پستول کا دستہ پڑتا۔ وہ بے ہوش ہوتے چلے گئے۔ حسن معاویہ بھی ان کا شکار ہوگیا۔ دونوں نے مل کر جیپ سیدھی کی، بم اٹھایا اور بے ہوش افراد کو پچھلے حصے میں ڈالا۔ شوفو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ جھونگاس اگلی کار کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پُرسکون طور پر کھنڈرات کی طرف جارہے تھے۔ ٹھکانے پر آکر انہیں باندھ دیا گیا۔ باس نے ایک کھنڈر کے اندر داخل ہوکر ایک جگہ سے ایک بہت بڑے سوراخوں والے پتھر کو لیور کے ذریعے اٹھایا۔ اچانک ایک ہولناک چیخ گونجی۔ شوفو اور جھونگاس نے حسن معاویہ اور اس کے ماتحتوں کو اٹھا کر اس پتھر کے ہٹنے سے جو خلا پیدا ہوا تھا، اس میں پھینک دیا اور خود تینوں جیپ اور کار کو چھپانے کے بعد لیور اٹھا کر اندر اتر گئے۔ لیور کے ذریعے پتھر کو پھر سوراخ کے منہ پر رکھ دیا گیا۔ گھپ اندھیرے کو باس کی ٹارچ نے دور کیا۔ روشنی پھیلتے ہی وہی دہشت ناک چیخ پھر گونجی۔ اس چیخ نے علی کو اٹھا دیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ

کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں ایک کونے میں جم کر رہ گئیں۔ اس طرف سے نگاہیں ہٹا کر اس نے باس کے چہرے پر جما دیں۔ وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولا:

"مسٹر باس یہ کیا چکر ہے؟" اس نے کونے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"کیا تم اندھے ہو۔ تمہیں کونے میں بیٹھی ہوئی ایک سو بیس سالہ بُڑھیا نظر نہیں آرہی۔ یہ بڑھیا ہماری قیدی ہے۔ اس تہ خانے میں پڑے ہوئے اسے برسوں بیت گئے ہیں۔ قریباً نصف سے زیادہ صدی ہو چلی ہے۔ یہ میرے باپ کی قیدی تھی اور اب یہ میری قید میں ہے۔ میرا باپ فوت ہوچکا ہے۔ اگر آج بھی میری یہ شرط مان لے، وہی شرط جو میرے باپ نے لگائی تھی، تو میں اسے آزاد کر دوں گا۔" باس نے کہا۔

"کون سی شرط اور یہ بوڑھی عورت اتنے خوفناک انداز میں کیوں چیختی ہے؟" علی نے پوچھا۔

"یہ آزادی کے لیے نہیں چیختی۔ اسی تہ خانے کے اوپر آج سے قریباً پچاس سال پہلے اس کے بیٹے کو اس کی نگاہوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا تھا، لیکن اس نے میرے باپ کی بات پھر بھی نہ مانی۔ پھر اسے قید کر دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ جس دن تو ہمارا مطالبہ مانے گی اسی دن اس قید سے رہائی نصیب ہو جائے گی۔ اپنے بیٹے کو ذبح ہوتے دیکھ کر یہ چیخی تھی۔ آج بھی یہ اسی منظر کو یاد کر کے چیختی ہے۔ اس کی چیخ تہ خانے سے پتھر میں بنے سوراخوں سے باہر جاتی ہے، لیکن آج تک اس چیخ کے بارے میں کسی نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کہ لوگ چیخ کو سن کر یہ سمجھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان کھنڈرات میں جنوں کا بسیرا ہے، بدروحوں کا ڈیرا ہے۔"

"اوہ! ہم نے آج تک اس طرف توجہ نہیں دی۔ صرف یہ سوچ کر کہ لوگوں کا وہم ہے۔ کوئی چیخ ویخ نہیں سنائی دیتی۔ اگر ہمیں علم ہوتا تو ہم اس مظلوم عورت کو تمہارے ظلم کے شکنجے سے ضرور نجات دلواتے۔ یہ بتاؤ کیا یہ کھنڈرات اور اس کے اردگرد کی زمین تمہاری ہے؟" علی نے سوال کیا۔

"باپ دادا کے زمانے سے ہماری چلی آرہی ہے۔ یہاں ایک بہت بڑی بستی قائم تھی۔ میرا دادا اس بستی کا سردار تھا۔ پھر دادا کے بعد میرا باپ سردار بنا۔ اس کی سرداری میں اس عورت کے بیٹے کو قتل کیا گیا۔ پھر اس کے قریباً سات سال بعد برصغیر کی تقسیم ہوئی۔ پاک لینڈ

بننے کے وقت ہم یہیں رہ گئے تھے۔ ہم انڈر آنہ نہیں گئے تھے۔ اس عورت کو ہر روز کھانا دیا جاتا ہے۔ اتنا کہ یہ زندہ رہ سکے۔ یہ ہمارے ہاتھ سے کھانا پینا تو پسند نہیں کرتی، لیکن اس لیے کھا لیتی ہے کہ زندہ رہ کر اپنی بات پر ڈٹی رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شافال تو مر جائے گا پر مجھے میرے مقصد سے نہیں ہٹا سکے گا۔ اپنی بات نہیں منوا سکے گا۔"

"بوڑھی اماں، یہ شافال تم سے کیا منوانا چاہتا ہے؟ تمہارا کیا جرم ہے کہ تم یہ قید کاٹ رہی ہو اور آج شاید تم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے، یہ کھانا یونہی پڑا ہے۔"

"بعض اوقات یہ کئی کئی دن نہ کچھ کھاتی ہے اور نہ پیتی ہے۔" باس نے بتایا۔

"تین چار دن کھائے پیے بغیر یہ زندہ کیسے رہتی ہے؟" علی نے باس سے سوال کیا۔

"بیٹے! کیا تو مسلمان نہیں ہے؟" بوڑھیا نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"الحمد للہ۔"

"تو پھر تو نے یہ سوال کیوں کیا؟"

"کیا مطلب؟" علی چونکا۔

"کیا تو نہیں جانتا ہمارے تیسرے خلیفہ، آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد حضرت عثمان غنی ذوالنورینؓ کو جب دہشت پسند، تخریب کاروں یعنی یہودی ابن سبا کے ٹولے نے ان کے مکان کو گھیر لیا تھا تو آپؓ چالیس دن بھوکے اور پیاسے کیسے زندہ رہے؟ حضرت عثمانؓ کو جب بھوک ستاتی تھی تو وہ قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دیتے تھے۔ اللہ کے کلام یہ اثر ہے کہ وہ بھوک اور پیاس پر غالب آجاتا ہے۔ کیا تو اب بھی سوال کرے گا کہ میں کھائے پیے بغیر زندہ کیسے رہتی ہوں؟"

"نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں۔" علی کا سر جھک گیا۔

"میرے پاس یہاں قرآن نہیں ہے، لیکن بچپن میں ہی میں نے قرآن حفظ کر لیا تھا۔ میں زبانی تلاوت کرتی ہوں۔"

"اس کا جرم کیا ہے شافال؟" علی نے گردن اس کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"میرے باپ دادا اس بستی کے سردار تھے۔ ہم ہندو ہیں، جو لوگ اس وقت اس بستی کے درمیان بنے ہوئے چبوترے پر نصب بت یعنی ہمارے دیوتا کو سجدہ نہیں کرتے تھے، ان کو

میرے باپ دادا قتل کر دیا کرتے تھے دیوتا کے قدموں تلے۔ اس بڑھیا نے میرے باپ کے حکم پر بت کو سجدہ نہ کیا، یہاں تک کہ اس کے بیٹے کو اسی جرم میں اس کے سامنے قتل کر دیا گیا کہ اگر تو بُت کو سجدہ نہیں کرتی تو پھر سمجھ لے تیرا بیٹا گیا۔ اس نے پھر بھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ اسے یہ کہہ کر قید میں ڈال دیا گیا کہ جس دن تو بُت کو سجدہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی، اسی دن تجھے اس قید سے رہائی نصیب ہو جائے گی، لیکن یہ آج تک نہیں مانی۔ اگر یہ آج بھی سجدہ کر لے تو میں اسے آزاد کر دوں گا۔"

"میں اس قید میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر تو سکتی ہوں پر اللہ کے سوا کسی بت کو یا قبر وغیرہ کو سجدہ نہیں کر سکتی۔ میں مسلمان ہوں۔ مسلمان اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ اگر کرتا ہے تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔" بوڑھیا نے جواب دیا۔

"بوڑھی اماں تمہارا ایمان آج کے مسلمانوں کے ایمان سے بہت بلند و بالا ہے۔ آج تم اپنے ہاتھوں سے اس بت کو توڑو گی جو آج بھی ان کھنڈرات میں اسی جگہ نصب ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ تم بت کو توڑو گے؟ الٹا میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" شافال دھاڑا۔

"ظلم آخر ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ تمہارا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب تم نقلی فائل ۳ کو سمیت جیل جاؤ گے مسٹر اعوان ساگری۔" تہ خانے کے اوپر سے آواز آئی۔

"کیا!" باس بری طرح چونکا۔

"مجرم کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ اپنی جیب کی طرف دیکھو ساگری۔ تم ایک چیز انجانے میں میرے گھر کے صحن میں گرا بیٹھے ہو۔" اوپر سے آواز آئی۔

"اوہ!" باس دھک سے رہ گیا۔

شاید اپنا پین گرا آئے ہیں مجرم صاحب؟" علی نے اوپر منہ کرتے ہوئے اپنے ابا جان سے سوال کیا۔

"ہاں۔ پین پر ان کا نام لکھا ہوا تھا جیسا کہ آج کل شوقیہ لوگ لکھواتے ہیں۔ اس پر سے انگلیوں کے نشانات اٹھوا کر دفتر میں موجود ان کے نشانات سے ملوائے گئے۔ ثابت ہو گیا کہ یہ پین اعوان ساگری کا ہے۔ افسوس کی بات ہے ہندو شافال عرف اعوان ساگری جیسے غدار لوگ محکمہ خارجہ جیسے

اہم محکموں میں سیکرٹری جیسے بڑے عہدوں پر ہیں، پھر خفیہ راز تو چوری ہوں گے۔ انسپکٹر عمر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"ہتھیار پھینک دو، اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔" آئی جی صدیق حسین نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔ ان کے ہمراہ ڈی آئی جی عثمان علی اترتے نظر آئے۔

اچانک علی نے باس کی توجہ ادپر دیکھ کر اس کے پستول پر جھپٹا مارا اور پستول چھین کر اس کی طرف تان دیا۔ انسپکٹر عمر مسکرا اٹھے۔

"اب تو تم بھی پستول پھینک دو۔ شوفو اینڈ جھونکا س یا گھاس۔" خالد نے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان تم نے علی کو نہ باندھ کر غلطی کی ہے، ورنہ اس وقت معاملہ ہمارے کنٹرول میں ہوتا۔ ہم ان سب کو جکڑ کر اس تہ خانے میں ڈال کر نکل جاتے۔ یہ بوڑھیا اپنے غم میں جیتی رہتی، کوئی اس طرف آکر نہ پھٹکتا آسیب سمجھ کر۔ یہ لوگ بھوکے پیاسے مر کھپ جاتے۔ پولیس انہیں تلاش کرتے کرتے بوڑھی ہو جاتی۔" شوفو نے ناراض ہوتے ہوئے باس سے کہا۔

"مجھ سے واقعی غلطی ہوئی ہے۔" اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہی کیا نقاب اتار دیا، کیونکہ اب یہ تمہارے لیے بے کار ہے۔" خالد نے کہا۔

"اپنے پاس رکھ لو۔ لنڈے بازار میں بیچ لینا، چار پیسے ہی ہاتھ لگ جائیں گے۔" علی نے کہا

"تمہارا یہ مشورہ اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہ بے چارا اب اللہ کے حکم سے پھانسی پائے گا۔" خالد بولا۔

مجرموں کو وہ اوپر لائے۔ انسپکٹر عمر نے بوڑھی اماں کو اٹھایا۔ علی نے انہیں اس کے بارے میں مختصراً بتا دیا تھا۔ وہ اس کے جذبہ ایمانی پر عش عش کر اٹھے۔ وہ واپسی پر بوڑھیا کے ایمان کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر گھوم گئے جو آج کل مزاروں اور درباروں پر نظر آتے تھے۔ ان مناظر میں نظر آنے والے بھی مسلمان کہلاتے ہیں اور یہ بوڑھیا بھی مسلمان ہے مگر کتنا فرق ہے۔ یہ فرق آج کسی کو نظر نہیں آتا، لیکن کل بروزِ قیامت بوڑھیا جیسے لوگ ہی کامیاب ہوں گے۔ ساری رات کیس میں گزر گئی تھی۔ جب وہ کاروں اور جیپوں میں شہر میں داخل ہوئے تو چاروں طرف سے اذان گونج رہی تھی، سجدے کے لیے ☆

آپ کے بھائی جان کے مشورے

محمد شفیق کوہستانی

س : بھائی جان مجھے روزانہ ایک عجیب سا خواب آرہا ہے میں دیکھتا ہوں کہ میرے پَر نکل آئے اور میں ایک بند کمرے میں قید ہوں میں ساری رات کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتا رہتا ہوں۔ صبح آنکھ کھل جاتی ہے۔ کوئی ایسا علاج بتائیں کہ خواب آنا بند ہو جائیں؟

(عیدو۔ ٹھگ پورہ)

ج : بھیّا عیدو لگتا ہے آپ کے ضمیر پہ کوئی بوجھ ہے جو کہ خواب میں آپ کو بار بار کسی جرم کی یاد دہانی کروا رہا ہے۔ مراقبہ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اپنے ہمسائے کی مرغی چرائی ہے اور ڈربے میں بند کر رکھی ہے۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔ اب آپ فوراً مرغی کو آزاد کر دیں ورنہ آپ نے اسے بیچ دیا تو پھر جو کچھ مرغی کے ساتھ ہوگا روزانہ خواب میں آپ کے ساتھ ہوگا۔

س : انکل میرے مالی حالات خراب ہیں کوئی وظیفہ بتائیں؟ (روح اللہ۔ جوڑی)

ج : آپ محنت کریں اس کے بعد اللہ پہ توکّل کریں۔ رہی وظیفے کی بات تو بھائی آپ مقامی زکوٰۃ کمیٹی کو وظیفے کی درخواست دیں۔ مجھے نہیں۔

س : یار۔ میں پہلے بالکل ٹھیک ٹھاک تھا مگر اب آہستہ آہستہ میری زبان غوطہ کھانے لگی ہے۔ اور میں کئی الفاظ درست تلفّظ کے ساتھ بول نہ سکتا۔ براہ کرم کوئی ایسا علاج بتاؤ کہ میری زبان قینچی کی طرح تیز ہو جائے؟ (سرمد ایوب۔ باؤلہ نگر)

ج : یار سرمد۔ جب نئی چیز آہستہ آہستہ پرانی ہو جائے تو اس میں نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی حال انسانی اعضاء کا ہے۔ جب زبان کو زیادہ استعمال کیا جائے (جیسا کہ آپ اکثر کرتے نظر آتے ہیں)، تو یہ کند ہو جاتی ہے اور الفاظ صحیح نہیں ادا کر پاتی۔ آپ ایک عدد زنبور، ایک عدد ریتی اور ایک عدد کوئلے کی انگیٹھی لیں۔ زنبور کو انگیٹھی میں اتنا گرم کریں کہ وہ سرخ ہو جائے۔ اب اس زنبور سے زبان کو پکڑ کر کھینچیے۔ زبان کو اس وقت تک کھینچتے رہیے جب تک آنکھیں باہر نہ ابل پڑیں۔ اب پہلے سے موجود ریتی سے زبان کی نوک اور کناروں کو خوب رگڑ رگڑ کر تیز کریں۔ یہ احتیاط رکھیے کہ زبان کھینچتے وقت جڑ سے نہ اکھڑ جائے ورنہ ویلڈ کروانی پڑے گی۔ اس عمل کے بار بار کرنے سے زبان میں تیزی اور روانی آجائے گی اور وہ غوطہ مارنے سے گریز کرے گی۔۔۔ درست کہہ رہا ہوں نا سرمد بھائی،

تجربہ کر کے دیکھو۔۔۔ شکریہ۔

س : بھیّا۔ میرے بھائی کو ہر کام الٹا کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے یہاں تک کہ وہ چلتا بھی الٹا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس پہ "سایہ" ہے، پلیز کوئی روحانی علاج بتا دیجیے۔

(انجم شمیم۔ ڈونگہ بونگہ)

ج : انجم شمیم بھیّا باجی (کیا کہوں۔ یہ میری مجبوری تھی) تو بھیّا باجی آپ کا نام اتنا پیچیدہ ہے کہ مجھے آپ کو اس طرح خطاب کرنا پڑ رہا ہے۔ بھیّا باجی میری روحانیت یہ کہتی ہے کہ آپ کا بھائی کئی دنوں سے وی سی آر پر ایک ہی کیسٹ بار بار "ریورس" کر کر کے دیکھ رہا ہے جس سے اسے ہر کام الٹا کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ آپ انہیں کوئی نئی کیسٹ لا کر دیں، بہت جلد آپ کے بھائی کی یہ شکایت جاتی رہے گی۔

س : میں نے چاند ستارے میں ایک تحریر بھیجی ہے کیا چھپ جائے گی؟

(کامران مرزا۔ آفتاب پور)

ج : اگر "ناقابلِ اشاعت" ہوئی تو ضرور چھپے گی۔

س : ڈیئر شفیق۔ مجھے چند دنوں سے یہ شک ہونے لگا ہے کہ میں انسان کے بجائے بیل ہوں۔ اب تو عادت یہاں تک آپہنچی ہے کہ میں محاوروں میں "آ بیل مجھے مار" کی جگہ "آ اشتیاق مجھے مار" کی گردان کرتا ہوں۔ مہربانی فرما کر علاج بتاؤ؟

(انکل اشتیاق۔ چاند ستارے)

ج : محترم انکل۔ آپ کو بغیر فیس کے مشورہ دینے کو جی تو نہیں چاہ رہا مگر انسانیت کی تڑپ مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ یہ مسئلہ طبّی کم ہے اور نفسیاتی زیادہ ہے۔ اگر آپ کا یہ شک کہ آپ واقعی "بیل" ہیں تو آپ فوراً کسی سینگوں والے بیل سے مقابلہ کر کے دیکھیے، سو اگر آپ واقعی بیل ہوئے (خدا نہ کرے) تو بیل آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ وہ حضرت انسان تو ہوگا نہیں کہ اپنی نسل کا کام تمام کرے۔۔۔ بصورت دیگر مجھے دوبارہ مشورہ دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

س : بھائی جان! میں ایک طالب علم ہوں۔ میری صحت ٹھیک ٹھاک ہے مگر چہرہ پچکا

ہوا ہے۔ اس کے علاوہ رنگ بھی صاف نہیں۔ پلیز کوئی ایسا علاج بتائیے کہ رنگ بھی صاف ہو جائے اور چہرہ بھرا بھرا لگنے لگے؟ (اخلاق احمد۔ مانسہرہ)

ج: بھائی اخلاق۔ آپ دو کلو بیسن لیں اور اس میں آدھا کلو گرم مصالحہ ڈال دیں اور پھر ایک کلو پانی اور ڈال کر انہیں مکس کریں۔ اوپر سے دو چار آلو بھی کاٹ کر ڈال دیں تو بہت ہی اچھا ہو۔ لیجیے "لئی" تیار ہو گئی۔ روزانہ رات کو چہرے پر لگا کر سوئیے۔ باقی جو "لئی" بچے اس کے پکوڑے تل کر کھائیے۔ کچھ ہی دنوں میں رنگ صاف اور چہرہ فُل فُل۔ سوری بھرا بھرا لگنے لگے گا۔

س: بھائی جان میری عمر قریبًا بیس سال ہے مگر میرا قد بہت چھوٹا ہے جس کی وجہ سے میں سخت احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں۔ پلیز قد بڑھانے کا مشورہ دیجیے؟

(فرزانہ ۔ فاروق آباد)

ج: فرزانہ بہن چھوٹا قد یا لمبا قد یہ سب اللہ کی دین ہے۔ آپ قطعی احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔ قد بڑھانے کے لیے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنا نام فرزانہ کے بجائے "مہنگائی" رکھ لیں۔ ہر بجٹ کے ساتھ آپ کا قد آسمان سے باتیں کرنے لگے گا۔

س: میں کاروبار کے سلسلے میں امریکہ جا سکوں گا یا نہیں؟ (لئیق ۔ خلیق آباد)

ج: آپ اگلے سال جائیں۔ اس سال ایئرپورٹ پر پکڑے جانے کا امکان ہے۔

س: میرا نام میلا ہے میرا ستارہ اور پتھر بتائیں؟ (میلا ۔ تربت)

ج: بھائی میلے آپ کا ستارہ شہابِ ثاقب کے نتیجے میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے جبکہ پتھر روڈ پہ بچھائے جانے والے "روڑے" ہیں۔

س: میری عمر بائیس سال ہونے والی ہے مگر اب تک میٹرک نہیں کر سکا کوئی مشورہ دیجیے؟

(ناصر۔ جڑانوالہ)

ج: بھیا آپ پریشان نہ ہوں اور خیالی دنیا سے باہر نکلیں۔ پہلے آپ ضلعی بورڈ سے رجسٹریشن تو کروالیں پھر میٹرک بھی کر ہی لیں گے آپ۔

س: انکل مجھے ایک خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہے یعنی مجھے آنکھیں بند کرنے کے بعد کچھ نظر

نہیں آتا۔ پلیز کوئی مشورہ دیجیے اور میرا علاج کیجیے۔؟ (صدیق فاروقی ۔ کورنگی)

ج: ابے تم لوگ میرے خلاف کیوں سازشیں کر کے مجھے "انکل" بولتے ہو بھیا میرے میں آپ کا بھائی جان ہوں بھائی جان۔ سمجھ گئے ــ ہاں رہی علاج کی بات تو آپ روزانہ رات کو سونے کے بعد اور جاگنے سے پہلے کالے نمک کے محلول سے آنکھیں دھوئیے۔ امید ہے آپ کی "بیماری" آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔

س: انکل۔ جلدی سے یو۔ این۔ او کی تعریف کریں؟

(عطاء الرحمٰن ـــ جیجال)

ج: بھیّا۔ یہ ایک ایسی صلح پسند تنظیم کا نام ہے جس میں اگر دو چھوٹی قوموں کا مسئلہ پیش کیا جائے تو مسئلہ ہی گم ہو جاتا ہے، جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کا مسئلہ درپیش ہو تو چھوٹی قوم گم ہو جاتی ہے اور اگر کسی دن دو بڑی قوموں کا مسئلہ پیش کیا گیا تو یقینًا یو۔ این۔ او ہی گم ہو جائے گی۔ آیا کچھ عقل شریف میں!!

س: بیٹے شفیق ... میرے بال آج کل یوں گر رہے ہیں جیسے کبھی پاکستانی ٹیم کی وکٹیں گرتی تھیں۔ پہلے میرے بال گھنے اور ملائم تھے مگر اب اس سے الٹ معاملہ ہے دل چاہتا ہے انہیں نوچ کر پھینک دوں مگر سنا ہے بال نوچنے کے لیے انسان کا پاگل ہونا ضروری ہے۔ براہ مہربانی میری مدد کریں۔ (پاگل ہونے میں نہیں بالوں کو گرنے سے روکنے میں؟)

(سعید ــ لاہور)

ج: محترم انکل سعید۔ بالوں کے گرنے کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی بال گرنے کی وجہ یہ کہ جسم میں وٹامنز کی کمی ہوتی ہے۔ دوسری وجہ بال گرنے کی یہ ہوتی ہے کہ انسانی کھوپڑی اندر سے خالی ہو تب بال گرتے ہیں۔ آپ یوں کریں کہ رات کو سوتے وقت ربڑ لوشن کا مساج سر میں کیا کیجیے۔ اس سے بال اینڈ کھوپڑی دونوں مضبوط ہو جائیں گی۔ صورت حال سے وقفے وقفے سے مطلع کرتے رہیے گا۔

سالگرہ مُبارک

چاند ستارے کے یہ قارئین ماہ ستمبر میں پیدا ہوئے :

- ریحان عمر قریشی ، الکریم منزل ، پھلیلی بازار ، حیدرآباد
- فرحان الحق ، ۸/۱۵/۱۰۱۶ عزیز آباد ، فیڈرل بی ایریا ، کراچی ۳۸
- صدف حفیظ ، نمبر، شاہین حویلی ، شاہ برہان روڈ ، پشاور شہر
- محمد اکرم ، مکان نمبر ۸/۵۶ ، محلہ شیر شاہی ، گلی لانگڑیاں ، جلالپور جٹاں، ضلع گجرات
- محمد نعمان ملک ، ۶ ،۴-۱ے بلاک ، گلشن راوی ، لاہور
- رانا اظہر علی ، ۵۴۹ - اے بلاک ، گلشن راوی ، لاہور
- طاہر رانا ، ۸۹- ایچ ، الیاس پارک ، آؤٹ فال روڈ ، لاہور
- سعید احمد سعید ، مکان نمبر ۹۱ ، سیکٹر نمبر ۳ ، کھلابٹ ٹاؤن شپ ، ہری پور ہزارہ
- نعیم سبحانی ، مکان نمبر ۷/۱۳۲ ، پنڈی بھٹیاں ، ضلع گوجرانوالہ
- عمر علی بیگ ، مکان نمبر ۴۳ ، محلہ چھوئی ویسٹ ، اٹک شہر
- شعیب احمد فیصل ، مکان نمبر ۹۱ ، سیکٹر نمبر ۳ ، کھلابٹ ٹاؤن شپ ، ہری پور ہزارہ
- اکبر علی ، المعصوم ٹاؤن نمبر ۳۶ ، فیصل آباد
- نمیرا خالد ، مکان نمبر ۳۵ - پی ، گلی نمبر ۷ ، محلہ محمد پورہ ، فیصل آباد
- محمد عارف انور خان ، پلاٹ نمبر ۲۲- ۲۱ ، گلی نمبر ۲ ، شاہ ولی اللہ روڈ ، دریا آباد ، لیاری ، کراچی

آپ اپنا نام ، پتا اور پیدائش کا مہینہ لکھ کر ارسال کریں ۔ آپ کا نام اور پتا اس ماہ کے چاند ستارے میں شائع کیا جائے گا ۔ اگر کسی وجہ سے آپ اپنا مکمل پتا شائع نہ کروانا چاہیں تو ساتھ ہی وضاحت کر دیں ـــــ شکریہ !

خط و کتابت کا پتا : اشتیاق احمد ، پوسٹ بکس نمبر ۱۲ ـــــ جھنگ

جیب کترا

بدر منیر
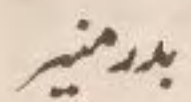
اخبار میں ایک خبر تھی۔

"جمالی میدان کے میلے میں نادر و نایاب ہیروں کی نمائش"

یہ خبر پڑھتے ہی اُن دونوں کی آنکھیں چمکنے لگیں، انہوں نے جلدی جلدی باقی خبر پڑھنا شروع کی، لکھا تھا :

"کل یعنی بروز اتوار پہلے کی طرح اس سال بھی جمالی میدان میں عظیم الشان سالانہ میلہ منعقد ہو رہا ہے، اور اس مرتبہ اس میلے میں بیش قیمت اور نادر و نایاب ہیروں کی نمائش بھی ہو رہی ہے جو ہیروں کا ایک مشہور و معروف تاجر افریقہ سے اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ تاجر اس میلے میں ان ہیروں کی نمائش کر رہا ہے"

خبر پڑھ کر انہوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں گہرے دوست تھے اور جیب کترے بھی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام اکرم اور دوسرے کا نام سلیم تھا۔ جب بھی کہیں کوئی میلہ یا جلسہ وغیرہ ہوتا ... وہ دونوں وہاں پہنچ جاتے اور اپنا کام کر گزرتے۔ وہ دونوں ہمیشہ اکٹھے ہی وارداتیں کرتے تھے۔ وارداتیں اِس ہوشیاری سے کرتے تھے کہ ایک بار بھی نہیں پکڑے گئے تھے۔

آج بھی وہ دونوں حسبِ معمول اکرم کے گھر کے قریب ہی ایک بَڑ کے درخت کے نیچے

بیٹھے اخبار میں کسی میلے یا جلسے وغیرہ کی خبر کی تلاش میں نظریں دوڑا رہے تھے کہ ان کی نظر اس میلے کی خبر پر پڑ گئی تھیں اور وہ مسکرا دیے تھے، کیونکہ یہ خبر ان کے مطلب کی تھی۔

چند لمحے بعد سلیم نے اکرم سے مخاطب ہو کر کہا:

"چونکہ اس میلے میں ہیروں کی نمائش بھی ہو رہی ہے، اس لیے ظاہر ہے، وہاں امیر اور شوقین لوگوں کا جمگھٹا ہو گا۔" اس کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ "اور ہم اپنا کام بآسانی کر سکیں گے۔" اکرم نے بھی جوشیلے لہجے میں کہا۔

"ہاں! لیکن اس مرتبہ ہمیں پھر ایسی منصوبہ بندی کرنی پڑے گی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" سلیم نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ "بالکل! اور اس کے لیے ہمیں ابھی سے منصوبہ بندی کرنا پڑے گی۔" اکرم نے جواب دیا اور وہ دونوں کل کے پروگرام کے لیے وہیں بیٹھے لائحہ عمل طے کرنے لگے۔

اچانک اکرم کو پیچھے سے ایک زوردار دھکا لگا اور وہ اچھل کر سامنے والے شخص سے ٹکرایا اور اسے اپنے ساتھ زمین پر ڈھیر کرتا چلا گیا، وہ جلدی سے بھنّا کر پلٹا اور اپنے پیچھے موجود سلیم کو گریبان سے پکڑ لیا۔ "تم نے مجھے دھکا دیا تھا ذلیل!" وہ غرایا اور اس سے پہلے کہ سلیم کچھ کہتا، اس نے ایک زوردار مُکّا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا اور وہ ڈکراتا ہوا، پیچھے کی طرف الٹ گیا اور اپنے ساتھ دو تین اور آدمیوں کو ڈھیر کرتا گیا۔ اکرم نے ایک بار پھر اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر لوگوں نے اس کو پکڑ لیا۔ دوسری طرف سلیم بھی اُٹھ چکا تھا اور اسے بھی لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اول فول بک رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد دونوں ہجوم سے اپنے آپ کو چھڑا کر مخالف سمتوں میں چل دیے اور لوگ دوبارہ میلے میں خریداریوں میں مصروف ہو گئے۔ یہ میلہ جمالی میدان میں لگا تھا اور آج تو یہاں پر بے پناہ رش تھا۔ لوگ خریداریوں میں مصروف تھے کہ اچانک ایک طرف سے چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہائے! میرا بٹوہ!" اور لوگ جلدی سے اس آواز کی طرف متوجہ ہو گئے، وہ ایک بوڑھا آدمی تھا، جو بدحواسی کے عالم میں جلدی جلدی اپنی جیبوں کو ٹٹول رہا تھا۔ "ہائے! نجانے کس ظالم نے میرا بٹوہ اڑا لیا ہے، ہائے! میری بیمار بچی! اب اس کا کیا ہو گا؟" بوڑھے آدمی نے روتے ہوئے کہا۔ ابھی اس

واقعے کو کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک اور رونی آواز سنائی دی "ارے! میری جیب!" لوگوں نے جلدی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی اپنی بغل کی جیب کو تک رہا تھا اور اس کا ہاتھ بغل کی جیب سے دوسری طرف نکل کر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

مختلف گلیوں اور سڑکوں سے ہوتا ہوا اکرم اقبال پارک میں داخل ہوا اور نیم کے ایک بڑے درخت کے نیچے سبز گھاس پر بیٹھ گیا۔ اب اُسے سلیم کا انتظار تھا۔

منصوبے کے مطابق انہوں نے جمالی میدان کے میلے میں لڑنے کی شاندار اداکاری کی تھی اور لڑتے لڑتے انہوں نے لوگوں سے اُلجھ کر ان کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر دیے تھے۔

سلیم کا انتظار کرتے ہوئے وہ سوچوں میں گم ہو گیا۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن میں ہی اس کا باپ فیکٹری کے ایک حادثے میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کے کوئی اور بھائی یا بہن بھی نہیں تھے۔ بس وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلا زندگی گزار رہا تھا۔ اسے اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔ اس کی ماں، ان کے گھر سے کچھ دور ایک سیٹھ کے ہاں نوکری کرتی تھی۔ اکرم نے کئی بار اپنی ماں کو سمجھایا تھا:

"دیکھو ماں! اب آپ کا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ آپ کام نہ کریں۔" مگر اس کی ماں ہر بار انکار میں سر ہلاتی اور کہتی:

"دیکھو بیٹے! میں یہ نوکری نہیں چھوڑ سکتی، کیونکہ سیٹھ صاحب کے بچے مجھ سے بہت مانوس ہو چکے ہیں اور وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اگر میں نے نوکری چھوڑ دی تو ان بچوں کا کیا ہو گا؟ وہ بچے مجھے نوکری نہیں چھوڑنے دیں گے اور پھر مجھے وہاں کام ہی کیا کرنا پڑتا ہے۔۔" اس کی ماں جذباتی انداز میں کہتی چلی جاتی تو وہ خاموش ہو جاتا۔ اس نے اپنی ماں کو یہی بتایا تھا کہ وہ ایک فیکٹری میں اچھی سی ملازمت کر رہا ہے۔ اب اُسے کیا پتا تھا کہ اس کا بیٹا لوگوں کی جیبیں کاٹتا ہے۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ تو شاید جیتے جی مر جاتی۔

اچانک وہ خیالوں کی دنیا سے چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا، دور سے اسے سلیم محتاط انداز میں اقبال پارک کی طرف آتا نظر آیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے اور سات بجے تک اس کی ماں بھی واپس آ جاتی تھی، اس لیے اسے سات بجے سے پہلے پہلے گھر پہنچنا تھا۔

نزدیک پہنچ کر سلیم نے اس سے ہاتھ ملایا اور مسکراتا ہوا اس کے پاس نیچے سبز گھاس پر بیٹھ گیا۔

"ہائے!" اس نے ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا، "تو نے مجھے ایسا زوردار دھکا مارا تھا کہ ٹھوڑی ابھی تک درد کر رہی ہے۔" اُس کے لہجے میں مسکراہٹ تھی "اور تُو نے کیا مجھے آرام سے دھکا دیا تھا، ایسا زوردار دھکا دیا تھا تو نے مجھے، کہ دن میں تارے نظر آ گئے۔" اکرم نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں ہنس پڑے۔

"اچھا چھوڑو اِن باتوں کو! دیکھیں تو سہی آج کیا تیر مارا ہے ہم نے۔" سلیم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور پھر ان دونوں نے اپنی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے۔

نیم کا یہ درخت چونکہ پارک کے ایک سائیڈ میں تھا اور ادگرد بڑی بڑی اور چوڑی جھاڑیاں بھی تھیں، اس لیے کسی کی ان پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں پارک سے نکل رہے تھے، اُن دونوں کی جیبیں بھری ہوئی تھیں اور دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ بٹوے وغیرہ انھوں نے وہیں ایک بڑی جھاڑی میں چھپا دیے تھے تاکہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

پارک سے نکل کر ان کے راستے جدا ہو گئے۔ سلیم پیدل ہی ایک سمت میں اپنے گھر کی طرف چل دیا، کیونکہ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا جب کہ اکرم نے ایک رکشے کو رکنے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد وہ رکشے میں بیٹھا اپنے گھر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ رکشہ ان کے گھر سے کچھ دور ہی رک گیا تو وہ سمجھ گیا کہ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی ان کے گھر کے سامنے والی بڑی سڑک پر ٹریفک کا بے پناہ رش ہو گا، اُس نے بل ادا کیا اور رکشے سے نیچے اتر گیا۔

پھر وہ اس بڑی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ٹریفک تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس سڑک کے دوسری طرف ان کا گھر تھا۔ مین سڑک ہونے کی وجہ سے اس سڑک پر ٹریفک کا بے پناہ رش ہوتا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دور اس سیٹھ کی عظیم الشان کوٹھی نظر آ رہی تھی، جہاں اس کی ماں کام کرتی تھی۔

جب ٹریفک کا زور کچھ تھما تو اس نے جلدی سے سڑک پار کر لی اور اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہو کر اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ سات بج رہے تھے، اس کی ماں بھی بس آنے ہی والی تھی۔ ابھی وہ بیٹھا چائے پی ہی رہا تھا کہ اچانک

باہر سے کسی گاڑی کے بریک چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دلدوز انسانی چیخ اور لوگوں کے شور و غل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے جلدی سے خالی کپ میز پر رکھا اور دوڑ کر باہر نکلا۔ باہر نکل کر وہ ششدر رہ گیا، اس کی ماں سڑک کے درمیان خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی اور اس کے جسم سے خون نکل کر سڑک پر ایک تالاب کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ وہ چیخ مار کر اپنی ماں کی طرف دوڑا اور اس پر گر پڑا۔ اس نے جلدی سے اپنی ماں کی نبض چیک کی، نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی، اسے جیسے ہوش آیا۔ اس نے جلدی سے اپنی ماں کو اٹھایا اور قریب ہی ایک ٹیکسی میں ڈال دیا جو کہ پہلے سے وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ اچھل کر اپنی ماں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو قریب ہی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال چلنے کو کہا۔ ٹیکسی بلا کی رفتار سے روانہ ہوئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایک پرائیویٹ ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں مڑ گئی۔ اس کی ماں کو افراتفری کے عالم میں ایمرجنسی وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔

اکرم وارڈ کے باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا، اچانک وارڈ کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر باہر نکل آیا۔ اس کو دیکھتے ہی اکرم تیزی سے اس کی طرف بڑھا:

"ڈاکٹر صاحب! کیسی ہے میری ماں! کوئی خطرے کی بات تو نہیں۔" اس نے ایک ہی سانس میں بے تابی سے پوچھا۔ ڈاکٹر اس کی بات سن کر ٹھٹکا اور پھر پوچھا:

"آپ کی ماں ہے وہ؟" اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر بولا: "ان کا خون بہت بہہ چکا ہے اور اسے خون کی اشد ضرورت ہے۔" اور پھر وہ اس کی طرف ایک چٹ بڑھاتے ہوئے بولا:

"اس وقت ہمارے پاس اس گروپ کا خون موجود نہیں ہے۔ آپ جلدی سے قریبی بلڈ بینک سے اِس چٹ پر لکھے گئے گروپ کا خون لے آئیں۔ اگر نصف گھنٹے تک خون نہ ملا تو پھر ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

اکرم نے اس کے ہاتھ سے چٹ لی اور ہسپتال سے باہر نکل کر تیز تیز قدموں سے بلڈ بینک کی طرف روانہ ہوا جو وہاں سے قریباً پچیس تیس قدم کے فاصلے پر تھا۔

اس نے اپنی ماں کو کئی مرتبہ سمجھایا تھا کہ اس سڑک کو احتیاط سے پار کیا کرے، مگر آج نہ جانے کیا بات ہوئی تھی۔ اس کی ماں سے سڑک پار کرنے میں بے احتیاطی ہوئی تھی یا گاڑی والے کی غلطی تھی۔

وہ سوچوں میں گم بلڈ بینک کی طرف جانے والی ایک گلی میں جیسے ہی تیزی سے مڑا، اچانک

سامنے سے آنے والا ایک شخص تیزی سے اس سے ٹکرایا اور اس کو اپنے ساتھ زمین پر ڈھیر کرتا گیا۔ اس آدمی نے جلدی سے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور "سوری" کہتا ہوا چلا گیا۔ اکرم بھی کپڑے جھاڑتا ہوا سامنے موجود بلڈ بنک میں داخل ہوا اور ہاتھ میں پکڑی چِٹ کاؤنٹر مین کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی۔ کاؤنٹر مین نے ایک نظر چِٹ پر ڈالی اور خون کی تھیلی لانے کے لیے اندرونی دروازے کی طرف مڑ گیا۔ جلد ہی وہ شخص خون کی تھیلی اٹھائے دروازے پر نمودار ہوا اور تھیلی کاؤنٹر پر رکھ دی۔ اکرم نے قیمت ادا کرنے کے لیے جیسے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا، اسے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا، اس کا ہاتھ جیب میں ہی رہ گیا، ایسا لگا جیسے اس کا ہاتھ اب کبھی جیب سے نہیں نکلے گا۔ اس کا بٹوہ جس میں اس نے واردات کی تمام رقم رکھی تھی، جیب میں موجود نہیں تھا۔ اس وقت اس کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"کیا ہوا جناب؟" کاؤنٹر مین کی آواز سُن کر اسے جیسے ہوش آیا، اُس نے جلدی جلدی باقی جیبوں کی تلاشی لی۔ اگرچہ اسے یقین نہیں تھا کہ بٹوہ اب کسی دوسرے کی جیب سے نکلے گا۔

اچانک اسے وہ شخص یاد آیا جو موڑ پر اس سے ٹکرایا تھا اور پھر اس کا اس طرح سے ٹکرانا اور اس کو سہارا دے کر اٹھانا بھی یاد آیا، اسے یقین ہو گیا کہ اس کا بٹوہ وہی شخص لے اُڑا ہے، چونکہ وہ خود ایک جیب کترا تھا اس لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس کی جیب پر بھی ہاتھ صاف کر سکتا ہے۔ وہ کاؤنٹر مین کو ہکا بکا چھوڑ کر اچھل کر باہر کی طرف دیوانہ وار دوڑ پڑا۔

موڑ پر پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، حسب توقع اس آدمی کے دُور دُور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا کبھی ایک گلی میں اور کبھی دوسری گلی میں دوڑتا رہا۔ گھڑی کی سوئیاں ٹھک ٹھک کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اور ڈاکٹر کے بتائے ہوئے نصف گھنٹے سے کچھ منٹ اوپر ہو رہے تھے۔ گھڑی کی سوئی کی ہر ٹھک اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی مانند برس رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا زرد ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

وہ پاگلوں کی طرح ہسپتال کی طرف دوڑ پڑا مگر وہاں بھی اس کے لیے کوئی اچھی خبر موجود نہ تھی، اس کی ماں بروقت خون نہ ملنے کی وجہ سے دوسری دنیا کو سدھار گئی تھی۔ وہ وہیں زمین پر گرتا چلا گیا۔ آج... اسے احساس ہو رہا تھا کہ دوسرے لوگوں کی جیبیں کاٹ کر اس نے نہ جانے کتنے معصوم بچوں کو یتیم کیا ہو گا... نہ جانے کتنی عورتوں کو بیوہ کیا ہو گا... نہ جانے کتنی ماؤں کی گودیں اجاڑ دی ہوں گی... مگر افسوس... اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے قدرت کی طرف سے سزا مل چکی تھی۔ ●

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے. اس کی آواز لرز رہی تھی. وہ کہہ رہا تھا "یاد رکھو اگر تم لوگوں نے اس فرقہ بندی سے نجات حاصل نہ کی تو تم اس پیارے پاکستان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے. اگر تم اس پاک دیس کی قدر کیا جانو یہ تمھیں بنا بنایا مل گیا. اس کی قدر مجھ سے پوچھو جس نے اس کی خاطر اپنے پورے خاندان کی قربانی دی. جس نے اس دیس کی خاطر سکھوں' ہندوؤں اور انگریزوں کی سختیاں جھیلیں. اس کی قدر ہمسایہ ملک میں رہنے والے مسلمانوں سے پوچھو کہ ایک آزاد وطن کیا ہوتا ہے. ان سے پوچھو کہ ان کی صبح اور شام کیسے ہوتی ہے. تم اپنے قائد کے فرمان کو فراموش کر چکے ہو جس نے ہمیں سندھی' بلوچی' پٹھان اور پنجابی بننے سے منع فرمایا تھا. بلکہ اس نے کہا تھا ہم ایک قوم ہیں. پاکستانی قوم ہیں. اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں. میرے بھائیو میں کوئی بہت بڑا سیاسی لیڈر نہیں مگر آپ لوگوں کو خبردار کر رہا ہوں. کہ ملک دشمنوں سے بچو. کیونکہ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ پاکستان مضبوط ہو. یہ لوگ اس کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں. اپنے گریبانوں میں جھانکو اپنے ضمیر کو آواز دو کہ آپ میں سے کون ہے جو پاکستان کے ساتھ مخلص ہے. آج مجھ سے عہد کرو کہ تم پاکستان کا ساتھ دو گے. ملک دشمن عناصر کا نہیں. وہ بولتا جا رہا تھا اور ہجوم بڑھتا جا رہا تھا. اس کی سحر انگیز تقریر نے سب کو جکڑ رکھا تھا وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر بولا.

"اللہ بھی اپنے قرآن پاک میں فرماتا ہے. اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو. اللہ کی رسی سے مراد قرآن پاک ہے. اے مسلمانو پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے. یہاں اللہ کا قانون ہی نافذ ہونا چاہیے. اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے. آپ میں سے کتنے ہیں جو میرا ساتھ دیں گے. ہاتھ اٹھاؤ"

سب ہجوم والوں نے ہاتھ اٹھا دیئے. فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی اور اسی گونج میں ایک زوردار گونج بم پھٹنے کی بھی تھی.

ان دنوں پورا ملک ہی دھماکوں کی لپیٹ میں تھا. روزانہ کسی نہ کسی جگہ بم پھٹنے کی اطلاع آتی اور بم کا نشانہ عموماً ایسی جگہ ہوتے جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا. سرکاری مشینری دھماکے روکنے اور ذمہ دار افراد کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی. صرف اتنا پتہ چلا تھا کہ دھماکے ہمسایہ ملک اور ایک اور سپر پاور مل کر کروا رہے ہیں. انہوں نے اپنے جاسوس پاکستان میں داخل کر دیئے تھے جو کہ مختلف شہروں میں گھومتے تھے اور دھماکے کرتے تھے.

دھماکے زیادہ کراچی میں ہو رہے تھے. جہاں فرقہ بندی عروج پر تھی. سندھی' پنجابیوں کو وہاں سے نکالنا چاہتے تھے وہاں ایسا زہر پھیلا ہوا تھا کہ جس کی کوئی حد نہ تھی. سندھیوں کا خیال تھا کہ پنجابی مہاجر ہیں. اس لئے ان کا پاکستان پر زیادہ حق نہیں بلکہ ہمارا ہے. مگر وہ لوگ حضور کی حیات مبارکہ کو فراموش کر چکے تھے. وہ مہاجرین مکہ اور انصارین مدینہ کے بھائی چارہ کو بھول چکے تھے. پورے سندھ میں روزانہ سینکڑوں آدمی دھماکوں میں مارے جاتے. اور حکومت اب تک کسی بھی ذمہ دار شخص کو گرفتار نہ کر سکی تھی. انسپکٹر بابر کی ڈیوٹی بھی ان دھماکوں کے ذمہ دار افراد کو گرفتار کرنا تھا مگر دو ماہ کی مسلسل کوشش سے بھی وہ ابھی تک اندھیرے میں تھے.

اس دن وہ ایک بھرے مجمع میں اس شخص کی گفتگو سن رہے تھے. وہ اس شخص کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور ان کا خیال تھا کہ بعد میں اس شخص سے ضرور ملیں گے. اتنے میں انہیں کوئی خیال آیا اور وہ ایک طرف کو چل دیئے. ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ پیچھے اللہ اکبر کے نعروں کی آواز سنائی دی. انہوں نے ایک نیا جوش اور جذبہ محسوس کیا. پھر ایک دھماکے کی آواز سنائی دی. انہوں نے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا لوگوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی. بہت سے لوگ خون میں لت پت تھے وہ فوراً وہاں پہنچے اتنی دیر میں پولیس کی گاڑیاں وہاں پہنچنا شروع ہو گئیں. انسپکٹر بابر اس شخص کو تلاش کر رہے تھے. جو تقریر کر رہا تھا انہوں نے دیکھا وہ خون میں لت پت تھا انہوں نے فوراً اسے اٹھایا اور ایک ایمبولینس میں ڈالا اور ڈرائیور سے کہا. انہیں لے جاؤ اور ڈاکٹر سے کہنا یہ بہت عظیم لیڈر ہیں. انہیں ہر حال

میں بچانا ہے۔ سارے زخمی ہسپتال منتقل کر دیئے گئے۔ کم از کم پچاس آدمی مر گئے تھے۔ اور
اتنے ہی تقریباً زخمی ہوئے تھے۔

انسپکٹر بابر نے ادھر ادھر نظر دوڑائی انہوں نے دیکھا ایک شخص بڑے عجیب سے
انداز سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر آسمان پر ایک سرخ لکیر دکھائی دی۔ سرخ لکیر دیکھ
کر وہ ایک طرف چل پڑا۔ انسپکٹر بابر بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ بڑے محتاط انداز سے اس
آدمی کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ آدمی ایک فون بوتھ کے سامنے کھڑا ہو گیا پھر اس نے ادھر ادھر
نظر ڈالی' انسپکٹر بابر فوراً ایک اوٹ میں ہو گئے۔ اور وہ فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ انسپکٹر بابر
آہستہ آہستہ چلتے فون بوتھ کے قریب پہنچے اور اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر اجنبی
نے دروازہ ایک ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر بابر نے زور لگایا اور اندر داخل ہو گئے۔ انہوں
نے اس سے کہا" مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے"۔

اجنبی بولا" میں آپ کو جانتا ہوں۔ انسپکٹر بابر مگر آپ ہمیں نہیں جانتے اگر میں
چاہوں تو آپ کو اس وقت قتل کر سکتا ہوں۔ مگر ہمیں آپ کو مارنے کا کوئی فائدہ نہیں مگر یاد
رکھو اگر تم نے ہمارے مشن میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو ہم تمہیں زندہ نہیں
چھوڑیں گے "اجنبی اتنا کہہ کر چلتا بنا اور انسپکٹر بابر اسے جاتا دیکھتے رہے۔

وہ ایک سرخ عمارت میں داخل ہوا تھا۔ یہ سرخ پتھر سے بنی ہوئی عمارت تھی جو دور
سے دیکھنے پر بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔ اس کا راستہ کمپیوٹر نے روکا تھا۔ اس نے کمپیوٹر
میں ایک کارڈ ڈالا اور کمپیوٹر نے اسے اوکے کا سبز اشارہ دے دیا وہ آگے چل پڑا وہ ایک
بڑے سے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ نہ اس نے دستک دی اور نہ ہی کوئی آواز نکالی۔
سامنے دروازے پر لگے ہوئے سرخ بلب کی روشنی اس کی آنکھوں میں پڑنے لگی۔ تھوڑی دیر
بعد سُرخ روشنی کی جگہ سبز روشنی نے لے لی اور پھر سبز روشنی بھی بند ہو گئی۔ اور ایک آواز
آئی" کم ان رابرٹ"۔
دروازہ خود بخود کھل گیا اور آنے والا رابرٹ اندر داخل ہو گیا۔" سر- رپورٹ" اس

نے کہا۔

" میں ویسے ساری رپورٹ ٹی وی پر دیکھ چکا ہوں۔ مگر تمہیں پتہ ہے ہمارا کمپیوٹر
اتنے فاصلے سے صرف تصویر لیتا ہے آواز نہیں آتی اس لیئے تمہاری رپورٹ سننی پڑے
گی"۔

"یس سر" رابرٹ نے کہا-

سر میں آپ کی ہدایت کی مطابق وہاں پہنچا میرا نشانہ تو سر ان کا سرغنہ تھا جس نے
ہلکی ہلکی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ مگر اس تک پہنچنا مجھے نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ انسپکٹر بابر وہاں
موجود تھا۔ اور اگر میں فائر کرتا تو یقینی بات تھی کہ وہاں پر موجود لوگ اور انسپکٹر خود مجھے روئی کی
طرح دھن کر رکھ دیتے۔ اس لئے سر میں نے بم پر وقت سیٹ کیا اور خود تھوڑی دور جا کر
کھڑا ہو گیا۔ میں خوش تھا کہ آج اس سرغنہ کے ساتھ انسپکٹر بابر بھی ختم ہو جائے گا۔ مگر وہ ایک
طرف کو چل پڑا۔ وہ تھوڑی دور گیا تھا کہ بم چل پڑا۔ اور وہ واپس بھاگ آیا اس نے سارے
زخمیوں کو اپنی نگرانی میں ہسپتال کی ایمبولینس میں ڈلوایا۔ اس سرغنہ کی حالت نازک تھی
مگر مجھے امید نہیں ہے کہ وہ بچ سکے گا۔

اور آپ نے مجھے جو سرخ لکیر کا سگنل دیا تھا وہ انسپکٹر بابر بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے میرا
پیچھا کرنا شروع کر دیا مگر میں نے اسے ایک فون بوتھ میں ڈاج دے دیا اور اب آپ کو
رپورٹ کر رہا ہوں۔

" ٹھیک ہے مگر اس سرغنہ کو بچنا نہیں چاہیے' چاہے اسے ہسپتال میں ہی کیوں نہ
ختم کرنا پڑے - اسے ختم کر دو اور اب جلد از جلد یہاں پر کام ختم کرو- ہمارا آخری نشانہ
اب دار لحکومت ہے- "باس نے کہا-

"او کے باس - میں تیار ہوں جلد ہی یہ کام ختم ہو گا" اور پھر رابرٹ باہر نکل آیا؟ باس
نے چہرے پر ہلکے ہلکے دو ہاتھ مارے تو اس کا چہرہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اب وہ مقامی آدمی معلوم

ہو رہا تھا. حالانکہ پہلے وہ یورپین معلوم ہوتا تھا.

□○□
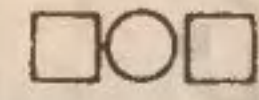
انسپکٹر بابر خود اس آدمی کا پیچھانہ کرنا چاہتے تھے. کیونکہ وہ انہیں جانتا تھا' انہوں نے فورا وائرلیس نکالی اور سول کپڑوں میں ایک آدمی کو ساری صورتحال بتادی - بعد میں انسپکٹر بابر نے ہسپتال کا رخ کیا' انہوں نے ڈاکٹر سے اس آدمی کا پوچھا' ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ زخمی ضرور ہیں' مگر اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے - انسپکٹر بابر نے کہا.

"کیا میں ان سے مل سکتا ہوں ؟" -

" جی ہاں آپ ان سے مل سکتے ہیں " - ڈاکٹر نے کہا -

وہ ڈاکٹر کی رہنمائی میں وہاں تک پہنچے - جہاں وہ شخص سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا بیڈ پر لیٹا تھا - اس کی آنکھیں بند تھیں - اس کے ایک طرف خون کی بوتل تھی اور دوسری طرف گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی - '

انہوں نے ہلکی ہلکی آواز میں اسے پکارا' اس نے آنکھیں کھول دیں اور انسپکٹر بابر کی طرف دیکھنے لگا - انسپکٹر بابر نے پوچھا' -

"کیا حال ہے آپ کا" - '

"میں اب ٹھیک ہوں -" اس نے کہا -

آپ کا نام کیا ہے -"

" میرا نام مولوی عبدالحق ہے اور میں ہمیشہ حق کی بات کہتا ہوں' مولوی عبدالحق شیر بنگال بھی تھے' انہوں نے بھی ہمیشہ حق کی بات کہی تھی' میں ان کے نقش قدم پر چل رہا ہوں - میں حق کی بات کہتا ہوں' چاہے وہ کسی جابر کے سامنے کہنی ہو چاہے تلوار کی نوک پر چاہے کلاشنکوف کے سامنے "

" بیٹے آج یہ لوگ اس دیس کی عظمت کو کیا جانیں -

کئی لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں - انہیں میں سچی باتیں بتاتا ہوں تو وہ ہنستے ہیں - مگر بیٹے

جو چیز ہاتھ پیر ہلائے بغیر مل جائے اس کی قدر نہیں ہوتی' انہیں یہ پاکستان بغیر ہاتھ ہلائے مل گیا ہے اس لیے یہ لوگ اس کی قدر نہیں کرتے - مگر بیٹے ہم سے پوچھو اس کی قدر جس نے ایک خواب کی تعبیر کے لیے خود اس میں حصہ لیا - اپنے ہاتھوں سے اس پودے کو لگایا ہے اور اس پودے کی آبیاری ہم نے اپنے خون سے کی ہے' آج یہ پودا تناور درخت ہے تو یہ لوگ جو اس کی عظمت کو نہیں جانتے اس کی شاخوں کو کاٹ رہے ہیں' اگر اپنے شاخوں کو کاٹتے رہے تو دشمن تو اس کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش میں ہو گا -

میرے سامنے میرے چھوٹے بھائی کو نیزے میں پرو دیا گیا' مگر میں نے اف نہ کی - میرے والدین کو سکھوں' ہندوؤں نے مار ڈالا میں نہ رویا - میرے پورے خاندان کو ایک حویلی میں بند کر کے آگ لگا دی گئی مگر مجھے زندہ چھوڑ دیا گیا' شاید اس لیے کہ میں یہ دیکھ سکوں کہ ہم نے جو پاکستان حاصل کیا ہے' وہ کتنے دن چل سکے گا - بیٹے آج مجھے ان لوگوں کی ذہنیت پر رونا آتا ہے جو پاکستان کے بازو بننے کی بجائے اس کی شاخوں کو تراش رہے ہیں - پہلے ہی ہم نے اپنی نااہلیوں سے پاکستان کا ایک بازو الگ کر دیا ہے پھر کشمیر کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا اور اب جو حصہ بچ گیا ہے اس میں کوئی سندھودیش کے خواب دیکھ رہا ہے' کوئی پختونستان چاہتا ہے - کوئی بلوچستان اور کوئی پنجاب الگ کروانے کے خواب دیکھ رہا ہے -" ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ جوش میں بولے چلے جا رہے تھے -

ان کا سانس اکھڑ رہا تھا ایک نرس آگے بڑھی اور اس نے ان کے بازو میں سکون کا انجکشن لگا دیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کی آواز کم ہوتی چلی گئی - وہاں کمرے میں موجود ہر ایک کے چہرے پر ندامت کی سرخی تھی اور آنکھیں نم تھیں -

□○□

" ہیلو سر - میں کریم بول رہا ہوں " اوور

انسپکٹر بابر اس وقت ہسپتال سے باہر نکل رہا تھا' وہ وائرلیس پر آواز سن رہا تھا - اس نے ایک

بٹن دبایا اور کہا

"یس انسپکٹر بابر بول رہا ہوں"

رپوٹ سر - میں نے اس اجنبی کا تعاقب کیا ہے اور وہ شہر کے مشرقی حصے میں ایک غیر آباد سرخ پتھر کی بنی ہوئی عمارت میں داخل ہوا ہے - میں وہاں کھڑا رہا - وہ تقریباً آدھا گھنٹہ اندر رہا - ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ باہر نکلا اور شہر کی طرف چل دیا - ابھی میں اس کا پیچھا کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص اس عمارت میں سے نکلا۔ اس نے محتاط نظروں سے ادھرا دھر دیکھا اور لمبی سی سیاہ کار میں شہر کی طرف روانہ ہوا' میں نے بڑے محتاط طریقے سے اس کا تعاقب کیا اور اس وقت وہ اس شہر کے مشہور ہوٹل بلیومون میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا ہے - یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ محض وقت گزاری کے لے وہاں بیٹھا ہوا ہے یا اسے کسی کا انتظار ہو - میں یہاں ایک غسل خانے سے آپ کو کال کر رہا ہوں - اب میرے لیے کیا حکم ہے' باہر دروازے پر دستک ہو رہی ہے میں وائرلیس بند کر رہا ہوں -

اس کے ساتھ ہی آواز آنی بند ہو گئی اور شوں شاں سنائی دے رہی تھی - انسپکٹر بابر نے فوراً اپنی گاڑی کی طرف دوڑ لگادی - پھر پانچ منٹ کی خطرناک ڈرائیونگ کے بعد ہوٹل بلیومون ان کے سامنے تھا وہ دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ مگر اس وقت بہت حیران ہوئے جب انہوں نے دیکھا کہ ہوٹل کے ہال کمرے میں لاشیں ہی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اندر داخل ہو گئے اور ایک آواز گونجی۔

"انسپکٹر بابر اپنی زندگی چاہتے ہو تو ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ میں اب تمھیں گولی مار سکتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ تمہاری موت میرے ہاتھوں سے ہو۔ اور مجھے خبر ہے کہ تم ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں بنو گے۔ میں تمہیں صرف یہ آخری موقع دے رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر تم نے ہمارے راستے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو تم صرف گولی کی آواز سن سکو گے جو تمہارے دل کے چاروں خانوں کو تباہ و برباد کر دے گی۔

ہر طرف خاموشی چھا چکی تھی۔ اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں انسپکٹر بابر کو یہ آواز بہت مانوس معلوم ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس شخص کو بہت اچھے طریقے سے جانتے ہیں۔ بے شک وہ آواز بدل کر بول رہا تھا۔ مگر وہ اپنا لہجہ نہیں چھپا سکا تھا انسپکٹر بابر کافی دیر سوچتے رہے۔ مگر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ انہوں نے کریم کو تلاش کرنا شروع کیا مگر لاشوں کے ہجوم میں اس کی لاش نہیں تھی۔ پھر اس کی لاش ایک باتھ روم سے مل گئی۔ دشمن نے صرف اس کے دل کا نشانہ لیا اور ایک ہی گولی اس کے لئے موت کا سامان لے آئی تھی۔

انسپکٹر بابر نے ہال ہی سے پولیس اسٹیشن فون کیا اور خود باہر آکر کھڑے ہو گئے۔ ان کا ذہن اندھیرے میں تھا ان کے لئے منزل کی کوئی کرن نہ تھی۔ انہوں نے جہاں سے کام شروع کیا تھا وہ ابھی تک وہیں تھے۔ اتنے میں پولیس پہنچ گئی۔ انہوں نے لاشوں کو ایمبولینس میں منتقل کرنا شروع کر دیا تقریباً رات کے گیارہ بجے تھے۔ انہوں نے پولیس والی وردی اتاری اور سادہ لباس پہن لیا۔ انہوں نے پستول اور گولیاں اپنی جیب میں منتقل کیں اور ایک گاڑی میں دوبارہ باہر نکل آئے۔ وہ یونہی بے مقصد سڑکوں پر چکر لگا رہے تھے۔ پھر انہوں نے جیب سے ایک پنسل نما چیز نکالی اور گاڑی روک دی۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس پینسل کا ایک بٹن دبا دیا۔ اس پنسل میں سے نارنجی رنگ کی شعاع نکلی اور آسمان پر پھیلنے لگی۔ شعاع مشرق کی طرف ایک مقام پر ٹھر گئی اور پھر ختم ہو گئی۔ انسپکٹر بابر گاڑی میں بیٹھے۔ انہوں نے ریڈی میڈ میک اپ کرنا شروع کر دیا ب وہ ایک انگریز کے روپ میں تھے۔ پھر وہ گاڑی ایک سڑک پر لے آئے اور مشرق کی سمت چل پڑے۔ یہ پنسل دراصل ایک زبردست ایجاد تھی۔ انسپکٹر بابر کو پتہ چلا تھا کہ دشمن جو کوئی بھی ہے۔ سائنسی میدان میں بہت ذہن رکھتا ہے۔ اور زیادہ تر سائنسی ایجادات ہی ساتھ لایا ہے۔ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ دشمن کو اس شہر میں ہونے والی ہر بات کی خبر ہے اور ان کے پاس جدید ترین کمپیوٹر ہیں اور ان میں سے لہریں ٹی وی کی لہروں کی طرح پھیلتی ہیں او

جہاں جہاں سے گزرتی ہیں. ان مناظر کے تصاویر کمپیوٹر پر دیتی ہیں. اور انسپکٹر بابر نے صرف لہروں کو چیک کرنے کے لئے کہ ان کا مرکز کہاں ہے. اس شعاع کو آسمان کی طرف پھینکا تھا اور یہ شعاع ان لہروں پر سفر کرتی ہوئی اس مرکز تک پہنچ کر ختم ہو چکی تھی اور انسپکٹر بابر کو امید تھی کہ اس کی اس حرکت کو کوئی چیک نہ کر سکا ہو گا. کیونکہ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا. تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک سرخ عمارت کے سامنے تھے. اندھیرے میں وہ عمارت بہت پر اسرار معلوم ہو رہی تھی. وہ گاڑی سے اترے اور بے خوف و خطر گیٹ کی طرف چل دیے. انہوں نے کال بیل پر انگلی رکھی. دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی. تھوڑی دیر بعد باہر دروازے پر لگے سپیکر میں آواز گونجی. "پلیز کوڈ اور برانچ" آواز میکانکی محسوس ہو رہی تھی. مگر تھوڑی دیر بعد وہی آواز دوبارہ گونجی تو انہوں نے کہا" باس کو اطلاع دو کہ فارمیکا آیا ہے"

"او کے" مشینی آواز گونجی

تھوڑی دیر بعد گیٹ پر لگے ہوئے سرخ بلب میں سے روشنی سیدھی ان کی آنکھوں میں پڑنے لگی. انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا. جیسے کوئی ان کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو. انہوں نے فورا ذہن کو بلینک کر لیا. چٹ کی آواز آئی اور سبز بلب روشن ہو گیا. اس کا مطلب تھا کہ وہ کمپیوٹر کو مات دینے میں کامیاب ہو گئے تھے. ایک مشینی آواز گونجی.

"مسٹر فارمیکا تم میک اپ میں ہو مگر تمہارا ذہن بالکل صاف ہے. اور اس میں تنظیم کے خلاف کوئی بات نہیں مگر تم ہیڈ کوارٹر میک اپ میں کیوں آئے ہو. اس کا جواب دو"

"میرے اس ملک میں بہت سے دشمن ہیں. اس لئے مجھے میک اپ کا سہارا لینا پڑا. کیونکہ میں بہت سے مشن پر اس ملک میں آچکا ہوں" انسپکٹر بابر نے کہا.

اچھا ٹھیک ہے. تم کمرہ نمبر ۱۰ میں داخل ہو جانا. وہاں باس تمہارا انتظار کر رہے "میکانکی انداز میں دروازہ کھلا اور انسپکٹر بابر محتاط انداز میں اندر داخل ہو گئے وہ بڑے محتاط قدموں سے چلتے رہے. دائیں ہاتھ کمرہ نمبر ۱۰ تھا. انہوں نے دستک دینے کی ضرورت محسوس نہ کی

اور پستول ہاتھ میں پکڑ کر دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے. سامنے ہی کوئی کرسی پر بیٹھا تھا اس کی پشت انسپکٹر بابر کی طرف تھی. انسپکٹر بابر کے ہاتھ کو ایک جھٹکا لگا. اور ان کے ہاتھ سے پستول نکل کر چھت سے چمٹ گیا. انہوں نے چھت کی طرف دیکھا پھر ایک بھاری آواز گونجی.

"مسٹر بابر ہمارے ہیڈ کوارٹر میں کوئی اسلحہ نہیں چلتا. تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہاری اس نارنجی شعاع کو چیک نہیں کیا. نہیں تم اس تنظیم کو غلط سمجھے ہو یہ تنظیم بہت تیز ہے. یہاں نہ صرف صبح کے وقت ڈیوٹی ہوتی ہے بلکہ ساری رات عملہ مستعد رہتا ہے. کمپیوٹر نے تمہاری شعاع کو چیک کیا. اور مجھے اطلاع دی. اگر میں چاہتا تو تمھیں وہیں کار میں ہی مروا دیتا. مگر میں تمہارا دیدار کرنا چاہتا تھا تم نے جس دیدہ دلیری سے اس ہیڈ کوارٹر میں قدم رکھا ہے. اس نے مجھے متاثر کیا ہے. تم جیسے بہادر لوگوں کو مرنا نہیں چاہیے. مگر یہ سن لو کہ اس علاقے میں ہونے والی پل پل کی خبر مجھے ہے. اور مجھے خبر ہے کہ کون میرے خلاف کیا بات کر رہا ہے. اور اس کے ساتھ ہی انسپکٹر بابر میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارا ساتھ دو اور یقین کرو اس ملک پر قابض ہونے کے بعد اس کا کوئی اچھا سا عہدہ تمھیں پیش کیا جائے گا اس ملک کے ہر شہر میں ہمارے آدمی پھیل گئے ہیں. اب چند دنوں کی بات ہے پھر یہ ملک ہمارا ہو گا بولو منظور ہے"

"انسپکٹر بابر آہستہ سے ہنس پڑا پھر اس نے کہا".

"مجھے پتہ ہے کہ تم کوئی بھی ہو مجھے اچھی طرح جانتے ہو تم میری عادت سے واقف ہو. یہ وطن ہمیشہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے. تم اس کو توڑنے کی بات کر رہے ہو. تم خود ٹوٹ پھوٹ جاؤ گے مگر یہ ملک نہ ٹوٹے گا. تم مجھے اچھا سا عہدہ دو گے میں اس عہدے پر تھوکتا بھی نہیں. میرا کام تم جیسے ملک دشمن کو ختم کرنا ہے. اس کے ساتھ مل جانا نہیں. اب بھی وقت ہے اپنے اس ناپاک ارادے سے باز آجاؤ. ورنہ تمہارے اس جسم کی ایک ایک بوٹی میں اپنے ہاتھوں سے کروں گا" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر بابر نے اس کی طرف چھلانگ لگائی مگر یوں

محسوس ہوا جیسے کسی طاقتور چیز نے انہیں روکا ہو اور وہ سامنے والی دیوار سے ٹکرائے اور بے ہوش ہوتے چلے گئے۔

□○□
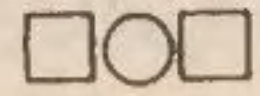
نفرت کی آگ نے پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جابجا دھماکے ہو رہے تھے۔ اگر کوئی صبح کو گھر سے نکلتا تھا تو شام کو اس کی لاش یا موت کی اطلاع آتی تھی۔ لوگ گھروں میں سہمے بیٹھے تھے۔ کئی شہروں میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں دھماکے کی خبر آجاتی۔ دھماکوں میں زیادہ تر باہر کا بنا ہوا اسلحہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اب پتہ چل چکا تھا کہ ان دھماکوں میں ہمسایہ ملک کے ساتھ ساتھ ایک سپر پاور بھی شامل ہے۔ مولوی عبدالحق اب بالکل ٹھیک ہوگئے تھے۔ انہیں دشمنوں نے مروانے کی بہت کوشش کی۔ مگر اللہ کی مدد سے وہ ہر حملہ سے بچ گئے۔ انسپکٹر بابر دس دن سے لاپتہ تھے۔ ان کی کوئی خبر نہ تھی۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنے طور پر انسپکٹر بابر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر دارالحکومت سے ایک اور انسپکٹر اویس کو بلایا گیا۔ یہ انسپکٹر بابر کے دوست بھی تھے اور رشتہ دار بھی۔ انہون نے پہلے کراچی کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ انہوں نے مولوی عبدالحق سے بھی بہت چیت کی اور وہ بھی ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک دن مولوی عبدالحق دوپہر کے بعد انہیں تقسیم پاکستان کی باتیں سنا رہے تھے۔ اور انسپکٹر اویس پوری توجہ سے سن رہا تھا کہ اچانک مولوی عبدالحق نے کہا۔

" آج کل تم ٹی وی دیکھتے ہو"

"نہیں تو مگر اس کی ضرورت کیا پیش آگئی" انسپکٹر اویس کو عبدالحق کی اس بات سے حیرانی تھی۔

"میں نے کل ٹی وی دیکھا تو اس میں بہت سی لہریں گڈمڈ تھیں اور تصویر صاف نہیں تھی۔ مجھے کوئی چکر محسوس ہوا تھا۔ مگر چھوڑو"

"نہیں نہیں آپ بات کریں" انسپکٹر اویس نے کہا

" اچھا یہ سامنے ٹی وی ہے، نشریات کا وقت تو نہیں مگر ٹی وی آن کرتا ہوں" مولوی عبدالحق نے کہا۔

مولوی عبدالحق اٹھے اور ٹی وی آن کر دیا۔ سکرین پر آڑھی ترچھی لکیریں تھیں۔ حالانہ عام حالات میں ایسا ناممکن تھا۔ انسپکٹر اویس بھی قریب آگیا اس نے چینل بدلنے شروع کر دئے۔ پھر ایک چینل پر مدہم سی تصویر تھی۔ انہوں نے مولوی عبدالحق سے انٹینا کا رخ تبدیل کرنے کو کہا- مولوی عبدالحق چھت پر گئے اور انٹینا کا رخ آہستہ آہستہ تبدیل کرنے لگے- انہیں ایک زوردار آواز آئی۔ بس کریں- اور مولوی صاحب جلدی سے نیچے آئیں۔ مولوی عبدالحق جلدی سے نیچے آئے- انسپکٹر اویس کی نگاہیں ٹی وی سکرین پر جیسے چپک سی گئیں۔ سامنے ہی سکرین پر ایک ہال کمرہ دکھائی دے رہا تھا- اس میں کمپیوٹر کی لمبی لمبی قطاریں تھیں - پھر یہ منظر غائب ہوا اور ایک اور منظر سامنے آیا۔ ایک شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔ شکل و صورت سے وہ مقامی دکھائی دے رہا تھا- وہ کچھ بول رہا تھا مگر آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ انسپکٹر اویس نے جلدی سے آواز پوری کھول دی- ایک بھاری آواز سنائی دے رہی تھی- کوئی پوچھ رہا تھا شاید ٹرانسمیٹر پر

" تمہارا مشن کیسا جا رہا ہے -"

" سر میں منزل کے قریب ہوں- جلد ہی آپ کو خوشخبری سناؤں گا- اس وقت اس حکومت کے چیدہ چیدہ آدمی میرے ہاتھ میں ہیں - اور میں جب چاہوں حکومت کا تختہ الٹ سکتا ہوں- ابھی اتنی باتیں ہی ہوئی تھیں کہ ایک مشینی آواز سنائی دی-

" سر کوئی آپ کی باتیں سن رہا ہے- اور آپ کو دیکھا جا رہا ہے۔"

"وہ شخص اچھل پڑا- تباہ کر دو - شعاع پھینک دو۔ جلدی کرو۔ ہری اپ- جلدی۔

مولوی عبدالحق اور انسپکٹر اویس نے یہ سنا تو فوراً باہر دوڑ لگادی۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی پہنچے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وہ منہ کے بل گر گئے۔ جب ان کے حواس بحال

ہوئے تو انہوں نے دیکھا۔ سارا مکان ملبہ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ نہ جانے ان کے پاس کونسے سائنسی حربے تھے۔ انسپکٹر اویس ایک آسودہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہنس دیئے -

" مجھے افسوس ہے مولوی صاحب کہ آپ کا گھر جل گیا۔ "

" نہیں یہ میرا گھر نہیں تھا- بلکہ میرا گھر پاکستان ہے - انسپکٹر صاحب یہ جل رہا ہے۔ اس کو اللہ کے لئے جلنے سے بچاؤ ورنہ کچھ نہ بچے گا- گھر تو پھر نیا مل جائے گا۔ مگر دیس نہ ملے گا اس کو ختم ہونے سے بچاؤ۔ اللہ کے لئے اس کی حفاظت کرو۔ اس کو بچاؤ۔ بچالو " وہ سسک رہے تھے رو رہے تھے۔ انسپکٹر اویس نے انہیں تسلی دی اور کہا " مولوی صاحب جب تک اس دیس میں آپ جیسے لوگ ہیں یہ زندہ رہے گا- قیامت تک یہ آزاد رہے گا- اس کے حسین نظاروں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا- انشاء اللہ میں جلد ہی ان دشمنوں تک پہنچ جاؤں گا-

○□○
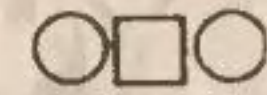
انسپکٹر اویس ملک کے مشہور و معروف سائنسدان عبدالکریم کے پاس بیٹھا تھا اور ان سے اس سارے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی - اس وقت مولوی عبدالحق بھی ان کے ساتھ تھے - انسپکٹر اویس نے پوچھا۔

" سر یہ دراصل چیز کیا ہے یہ تو بہت تباہی والی ایجاد ہے کہ جب چاہا کسی کو نشانہ بنالیا "

" ہاں یہ بہت تباہی والی ایجاد ہے - ہر ایجاد کے دو پہلو ہوتے ہیں ' اس کو نیک مقاصد کے لے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور برے مقاصد کے لیے بھی - اب جو تخریب کار ہیں اس کو برے مقاصد کیلئے استعمال کر رہے ہیں - میں نے اس ایجاد کے متعلق بین الاقوامی سائنس میلے میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس وقت یہ ایجاد ابتدائی مراحل میں تھی ' لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ یہ کبھی مکمل ہو جائے گی - اب مجھے سو فی صد یقین ہے کہ اسی سپر پاور کے

تخریب کار ہمارے ملک میں ہیں - میں آپ کو اس ایجاد کے کام کرنے کا طریقہ بتاتا ہوں - یہ سارا کام کمپیوٹر کا ہے - کمپیوٹر میں سے لہریں نکلتی ہیں جو ٹیلی ویژن کی لہروں کی طرح پھیل جاتی ہیں اور اس طرح جہاں جہاں یہ لہریں جاتی ہیں ' وہاں کی فلم اور تصویریں کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتی ہیں - اور کمپیوٹر کو کنٹرول کرنے والا جب چاہے جہاں چاہے ' ان لہروں کی وجہ سے تباہی مچا سکتا ہے - اس طرح اگر یہی حال رہا تو ہمارا ملک تو بہت جلد تباہ برباد ہو جائے گا ان کو روکنا ہو گا - جیسے بھی ہو سکے - "

" سر کوئی ایسی ایجاد جو اس کا توڑ کر سکے " - انسپکٹر اویس نے پوچھا '

" نہیں ' فی الحال تو میں نے اس پر کوئی کام نہیں کیا مگر اب انشااللہ میں ایک دو دن تک اس کا توڑ دریافت کر لوں گا - آپ پرسوں مجھ سے پتہ کر لیں۔ یاد رکھیں انسپکٹر جب ظلم کی حد سے بڑھ جائے تو پھر ظلم کرنے والا مٹ جایا کرتے ہیں " پروفیسر نے کہا -

" اچھا سر ہمیں اجازت دیں ' ہمیں اور بھی کئی کام کرنے ہیں " انسپکٹر نے کہا

" اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے " پروفیسر نے کہا -

مولوی عبدالحق اور انسپکٹر اویس باہر نکل آئے - وہ پیدل ہی آئے تھے اور اب کسی سواری کی تلاش میں تھے کافی دور تک وہ پیدل چلے مگر کسی سواری کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا - رات کے دو بج چکے تھے - ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا - انسپکٹر اویس اور مولوی عبدالحق کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ دونوں آپس میں ملکی حالات پر باتیں کرتے چلے جا رہے تھے - اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو - بہت جلن محسوس ہو رہی تھی - وہ تیز بھاگنے لگے مگر جتنا تیز بھاگتے تھے اتنی ہی جلن زیادہ ہو جاتی - ان کے حلق سوکھ گئے زبانیں باہر نکل آئیں - ان کے ذہنوں پر اندھیروں کی یلغار

ہونے لگی - آخر کار دونوں لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑے - آخری تصور ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ جیسے کئی آدمیوں نے مل کر اٹھایا ہو -

ایک ہال کمرے میں اس وقت بہت سے لوگ جمع تھے 'ان کے درمیان ایک کمپیوٹر رکھا ہوا تھا جس پر مختلف مناظر دکھائی دے رہے تھے 'ہر لمحے منظر تبدیل ہو جاتا تھا- آپریٹر کمپیوٹر کو آپریٹ کر رہا تھا- پھر ایک منظر پر نقاب پوش نے ہاتھ کے اشارے سے آپریٹر کو رکنے کے لئے کہا- آپریٹر رک گیا اب منظر صاف دکھائی دے رہا تھا- آخری کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے جو کہ مقامی معلوم ہو رہا تھا کہا-

" سر ان میں ڈاڑھی والا مولوی عبدالحق ہے اور دوسرا انسپکٹر اویس ہے جو دارالحکومت سے آیا ہے "-

دوسرے شخص نے سر ہلا دیا- منظر چلتا رہا- انسپکٹر اویس پروفیسر عبدالکریم سے ملے ساری گفتگو وہاں پر موجود ہر شخص نے سنی - پھر جب عبدالکریم نے یہ کہا کہ پرسوں تک آپ مجھ سے اس کا توڑ لے لیں تو وہ سبھی چونک پڑے - ان میں سے ایک بولا-

"تو کیا اس کا توڑ ہو سکتا ہے "-

"نہیں یہ ویسے ہی ان سے دل لگی کر رہا ہو گا ورنہ یہ ایسی ایجاد ہے کہ آئندہ دو تین صدیوں میں کوئی اس کا توڑ نہیں کر سکے گا"

" سر ہو سکتا ہے یہ توڑ کر ہی لے 'کیونکہ مسلمان ایک تو اپنے قول کے پکے ہوتے ہیں اور دوسرا ان میں کام کی لگن بہت ہوتی ہے 'یہ جس کام کا بیڑا اٹھالیں اس کو پورا کر کے ہے دم لیتیں ہیں "--

"کون مسلمان 'ان میں اب کوئی مسلمان نہیں کوئی پاکستانی نہیں 'اب یہ سندھی

ہیں - بلوچی 'پنجابی اور پٹھان ہیں - ان میں سے کسی سے پوچھ کہ دیکھ لو کہ تم کون ہو 'وہ فخر سے بتائے گا کہ میں بلوچی ہوں 'سندھی ہوں 'پنجابی ہوں پٹھان ہوں 'وہ یہ نہیں کہے گا کہ میں مسلمان ہوں - میں پاکستانی ہوں - ان میں اب کوئی کام کا جزبہ نہیں ہے 'یہ لوگ اب اس قابل نہیں کہ اس ملک میں رہ سکیں 'میں ذرا اس ملک پر قبضہ کر لوں پھر میں ان سب لوگوں کو فنا کر دوں گا"

" سر یہ آگ بھی تو ہماری لگائی ہوئی ہے 'ہم نے ہی انہیں ان ساری باتوں میں ڈالا ہے - سندھیوں کو کہا ہے کہ پاکستان تو تمہارا 'کیونکہ تم پہلے سے اس سر زمین پر تھے - پنجابیوں کو بھڑکایا 'بلوچی اور پٹھان بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں - اب وہ دن دور نہیں جب اس ملک پر ہماری حکومت ہو گی "ان میں سے ایک بولا تھا.

انہوں نے خاموشی اختیار کی اور سکرین کی طرف دیکھا- انسپکٹر اویس اور مولوی عبدالحق خاموشی سے اندھیرے میں چلے جا رہے تھے کبھی کبھی وہ آپس میں مسکراتے اور پھر خاموش ہو جاتے -

نقاب پوش نے آپریٹر سے کہا-

"تم ایکس والا نمبر دباؤ " آپریٹر نے لیس سر کہا اور نمبر پریس کر دیا-

انہوں نے دیکھا چند لمحوں میں انسپکٹر اویس اور عبدالحق ڈولتے پھر رہے تھے - وہ بھاگتے تھے 'رک جاتے تھے 'مگر کسی لمحے انہیں چین نہیں تھا- آخر کار ہانپتے ہوئے وہ دونوں گر پڑے -

"اب جوزا کے آدمیوں سے کہ دو کہ وہ انہیں ہیڈ کواٹر میں لیں آئیں اور ہاں اپنا ایک آدمی لیبارٹری میں بھیج دو اور اس سے کہ دو کہ وہ لیبارٹری کے کسی آدمی کی جگہ لے

لے 'اس پر وہ میز کے ساتھ ہی رہے" باس نے آپریٹر کو ہدایات دیں - اور خود اٹھ کر چلا گیا -

جب انسپکٹر اویس کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا' ان کے ساتھ ہی انسپکٹر بابر لیٹا ہوا تھا - اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا' یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر بہت تشدد کیا گیا ہو - اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سویا ہوا تھا - مولوی عبدالحق ابھی تک بے ہوش تھے - اس نے مولوی عبدالحق کا منہ اور ناک ہاتھ سے بند کیا - تھوڑی دیر میں مولوی عبدالحق ہوش میں آ گئے 'پھر یہی عمل انسپکٹر اویس نے انسپکٹر بابر کے ساتھ بھی کیا اور اسے بھی ہوش میں لے آئے - انسپکٹر بابر کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا - مگر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی چمک نہ تھی - انسپکٹر اویس نے اسے جھنجوڑا تو اس نے آنکھیں ادھر ادھر گھمائیں - پھر اس نے مولوی عبدالحق کی طرف دیکھا اور پھر انسپکٹر اویس کی طرف دیکھا -

انسپکٹر بابر کی آنکھیں چمک اٹھیں - انسپکٹر اویس تم اور مولوی عبدالحق آپ یہاں. آپ ان کے قابو میں کیسے آ گئے اور انسپکٹر اویس تم کب سے یہاں آئے ہوئے ہو -

بابر بھائی میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں. پہلے آپ بتائیں ان لوگوں نے آپ پر تشدد تو نہیں کیا"

"بہت تشدد کیا ہے - مجھے کہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ مل جاؤ مگر اویس میں بھلا ان دشمن عناصر کے ساتھ کیسے مل سکتا ہوں - پلاس سے میرے ناخن کھینچے' مجھے مسلسل چار دن سونے نہیں دیا گیا. مگر میں اپنی راہ سے نہیں ہٹا - میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان جب کوئی عہد کر لیتا ہے - تو وہ مر سکتا ہے. مگر جھک نہیں سکتا - اچھا چھوڑو سناؤ تم یہاں کیسے پہنچے"

اور جواب میں انسپکٹر اویس نے مختصراً سارا حال بیان کر دیا. پھر اچانک کمرے میں

آواز گونجنے لگی -

"خوش آمدید میرے پیارے دوستو - مجھے امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے - میں آپ لوگوں کو قید تو نہیں کرنا چاہتا تھا - کیوں کہ آپ میرے بہت اچھے دوست رہ چکے ہیں. مگر اپنے باس کے کہنے پر میں نے آپ کو قید کیا ہے. آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی - صرف چند روز کی بات ہے پھر یہ ملک ہمارا ہوگا - پھر آپ کو آزاد کر دیا جائے گا - آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں - میں آپ کے لئے کھانا بھجوا رہا ہوں - اس پروفیسر نے بھی انسپکٹر اویس کو کھانا نہیں کھلایا - میں نے سوچا کہ چلو میں ہی کھانا کھلا دیتا ہوں - اس کے ساتھ ہی آواز آنی بند ہو گئی -

انسپکٹر بابر نے اویس سے کہا "میرے ذہن میں یہ آواز گونجی ہے. مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اس شخص کو بہت اچھے طریقے سے جانتا ہوں"

"ہاں مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا ہے - جیسے میں نے اس آواز کو بہت قریب سے سنا ہو. پھر اچانک دونوں کی آنکھیں چمک اٹھیں' دونوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ایک دوسرے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا - انسپکٹر اویس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی ایک دیوار میں آہنی ٹیلی ویژن لگا دکھائی دیا - انہوں نے جلدی سے اس کو توڑ دیا - اور سپیکر کو بھی ایک چاقو سے کاٹ دیا - اس کی تاریں نکال کر پھینک دیں -

"ہاں اب بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا نام آیا ہے" انسپکٹر بابر نے کہا -

"نہیں ایسے نہیں ہم اپنے اپنے نام مولوی عبدالحق کے کان میں کہیں گے. پھر دیکھیں گے. کہ ہمارے ذہن میں کس کا نام آیا ہے" انسپکٹر اویس نے کہا -

پھر دونوں نے اپنے اپنے ذہن میں آئے ہوئے نام مولوی عبدالحق کے کان میں بتا

دیئے -

مولوی عبدالحق نے کہا" دونوں نام ایک ہی ہیں -"

"کیا" دونوں حیرت سے چلائے اور پھر ہولے سے مسکرا دئے - اتنے میں یوں محسوس ہوا جیسے دروازہ کھل رہا ہو - انسپکٹر اویس اور انسپکٹر بابر دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے آنے والے کے ہاتھ میں ٹرے تھی اور اس کے کندھے کے ساتھ کلاشنکوف لٹک رہی تھی. انپسکٹو بابر نے ایک زبردست مکہ اس کے منہ پر رسید کیا دوسری طرف سے انسپکٹر اویس نے ایک زوردار ٹانگ اس کی کمر پر رسید کی وہ گر پڑا کھانا ادھر ادھر بکھر گیا- مولوی عبدالحق نے جلدی سے اسے چھاپ لیا. اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور اس کے منہ میں اپنا رومال ٹھونس دیا. اس کی کلاشنکوف انسپکٹر بابر کے ہاتھوں میں تھی. انہیں سو فیصد امید تھی کہ ان کی اس کارروائی کو کوئی نہ دیکھ سکا ہوگا- کیونکہ وہ اس کا انتظام پہلے ہی کر چکے تھے. اب مسئلہ باہر نکلنے کا تھا. انسپکٹر بابر نے دروازے کی اوٹ سے باہر دیکھا طویل راہ داری تھی جو گیٹ تک جاتی تھی. انہیں امید تھی کہ اس عمارت کی حفاظت کے لئے کوئی زیادہ آدمی نہیں ہوں گے. کیونکہ سارا انظام کمپیوٹرائزڈ تھا. اس لئے انہیں ہر طرف سے اطمینان تھا. اب مسئلہ کمپیوٹر سے بچ کر نکلنے کا تھا. کیونکہ راہ داری یقیناً کمپیوٹرائزڈ تھی. مولوی عبدالحق نے ایک پلیٹ پکڑی اور اس کو راہ داری میں پھینکا. نہ جانے کہاں سے ایک شعاع آئی اور سٹیل کی پلیٹ جل کر راکھ میں تبدیل ہوگئی. وہ سمجھ گئے کہ وہ صرف اس کمرے میں محفوظ ہیں -

"میرے خیال میں ضرور اس کے پاس ایسی چیز ہے کہ کمپیوٹر اسے راستہ دے دیتا ہے. انہوں نے بے ہوش آدمی کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے ایک لاکٹ بر آمد ہوا . وہ

عجیب ساخت کا تھا. مولوی عبدالحق نے وہ لاکٹ گلے میں ڈالا اور کہا

"میں جا رہا ہوں میرے لئے دعا کرنا"

"میں جاتا ہوں مولوی عبدالحق صاحب آپ یہاں ٹھریں " انسپکٹر بابر نے کہا.

" نہیں انسپکٹر صاحب ابھی آپ کی زیادہ ضرورت ہے. اچھا اللہ حافظ" مولوی صاحب راہ داری میں نکل آئے مگر کچھ نہ ہوا یہ دیکھ کر دونوں کی جان میں جان آئی -.

"میرے خیال میں جس چیز کو بھی ہاتھ لگاؤں گا وہ کمپیوٹر سے محفوظ ہو جائے گی. یہ ذرا اندر کمرے سے پلیٹ دینا تجربہ کر لوں" مولوی عبدالحق نے کہا-

انسپکٹر بابر نے ان کو پلیٹ دے دی مگر کچھ نہ ہوا پھر مولوی صاحب نے پلیٹ کو تھوڑی دور پھینک دیا. پلیٹ پر ایک شعاع پڑی اور وہ راکھ میں تبدیل ہوگئی. اب مولوی عبدالحق نے انسپکٹر بابر اور اویس کا ہاتھ پکڑا اور تینوں باہر گیٹ کی طرف چل پڑے انہیں راستے میں کوئی مشکل نہ پیش آئی. انہوں نے گیٹ پر جا کر دیکھا. گیٹ خود بخود کھل گیا اور وہ خاموشی سے باہر نکل آئے. مولوی عبدالحق نے کہا

"جب تک یہ لاکٹ ہمارے پاس ہے ہم کمپیوٹر کی لہروں سے محفوظ ہیں اب وہ ہمیں چیک تو کر سکتے ہیں مگر نشانہ نہیں بنا سکتے"

وہ یونہی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چل رہے تھے -

☐○☐
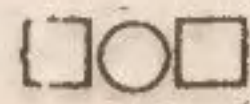
نقاب پوش آدمیوں پر گرج رہا تھا-

"الو کے پٹھو بتاؤ تینوں کہاں نکل گئے. اللہ کی پناہ' وہ کمپیوٹر سے بھی بچ گئے کیا وہ کوئی

مافوق الفطرت چیز ہیں. جو وہ اس سے بچ گئے ہیں . ذرا جلدی چیک کرو کہاں ہیں وہ "

" سر میں نے تمام سکرینوں پر چیک کیا ہے ان کا کچھ پتہ نہیں چل رہا' انہیں زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے. ایک آدمی نے ٹی وی سکرین سے سر اٹھا کر کہا -

"اچھا! میرے خیال میں وہ اس شہر سے نکل گئے ہیں' کیونکہ اگر اس شہر میں ہوتے تو یقیناً کمپیوٹر انہیں پکڑ لیتا. بہرحال پھر بھی احتیاطا اپنے آدمیوں کو ان کی تلاش میں لگا دو "نقاب پوش آدمی نے کہا.

" سر میں تمام آدمی ان کی تلاش میں لگاتا ہوں' لیکن سر مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ اسی شہر میں ہیں " ایک نے کہا

" تم کیسے کہہ سکتے ہو " نقاب پوش نے پوچھا'

" سر ہو سکتا ہے وہ میک اپ میں ہوں اب کمپیوٹر کو ان کی شکلیں دکھائی گئی ہیں اگر وہ میک اپ میں ہوں تو کمپیوٹر ان کو کس طرح پہچان سکتا ہے "

"ہاں یہ بات تو ہے " نقاب پوش نے کہا.

اتنے میں ایک آدمی اندر داخل ہوا' اس نے کہا

" سر ٹونی کا لاکٹ غائب ہے "

" ہوں ! تو اس کا مطلب ہے اس لیے کمپیوٹر نے انہیں کچھ نہیں کہا. ایسا کرو کمپیوٹر کو لاکٹ کا نمبر دو پھر کمپیوٹر خود ہی ان کو ڈھونڈ نکالے گا " نقاب پوش نے کہا.

"یس سر " آپریٹر نے سر ہلایا -

پھر وہ سامنے لگے ہوئے ڈائیلوں میں سے مختلف ڈائل گھمانے لگے سرخ سبز' نارنجی اور مختلف رنگ جلنے بجھنے لگے اور پھر صرف سرخ رنگ جلنے لگا.

" سر لاکٹ کا سرکٹ توڑ دیا گیا ہے " آپریٹر نے کہا

"اوہ یہ تو برا ہوا' اچھا جیز تم جوزا کے آدمیوں کو ان کی تلاش پر لگا دو " نقاب پوش نے کہا.

اور پھر نقاب پوش باہر نکل گیا

○□○
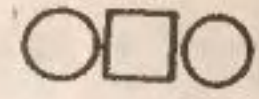
اگست کا مہینہ شروع ہو چکا تھا. یہ وہی مہینہ تھا جس مہینے پاکستان آزاد ہوا تھا. تخریب کاروں نے کھلم کھلا کہا تھا. اگر ۱۴ اگست کو پاکستان آزاد ہوا تھا تو ۱۴ اگست کو ہی پاکستان کا نام و نشان دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا. حکومت بوکھلا چکی تھی. صوبائی عصبیت کے ساتھ ساتھ لسانی اور فرقہ بندی کے فسادات بھی شروع ہو گئے تھے. ہمسایہ ملک کی فوجیں سرحد کے ساتھ جمع ہونا شروع ہو چکی تھیں. مسئلہ کشمیر ایک دفعہ پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا. روزانہ کشمیر میں سینکڑوں مسلمان شہید ہوتے . وہاں بھی داخلی انتشار حد سے بڑھ چکا تھا. پاکستان اپنے اندرونی انتشار کی وجہ سے اندرونی طور پر بہت کمزور ہو چکا تھا. حکمران بس گدی کو بچانے کی فکر میں تھے. روزانہ اخبارات میں ایک دوسرے کی ذات پر کیچڑ اچھالا جاتا تھا. پہلے تو اکا دکا دھماکے ہوتے تھے. اب روزانہ میزائیل چلنے شروع ہو چکے تھے. پاکستان جل رہا تھا سپر پاور بھی پاکستان کی بجائے ہمسایہ ملک کا ساتھ دینے کو تیار تھیں.

ایسے حالات میں ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا. جن کے پاس پیسہ تھا وہ تو پاکستان سے نکل چکے تھے. جنہیں پاکستان سے پیار تھا وہ اس کے لئے تن من دھن کی قربانی دینے کو تیار تھے. اگست کے مہینے کے شروع میں ہی جشن آزادی کی تیاریاں شروع کر دی جاتی تھیں مگر اس بار تو بارود کی بو ملک کی ہواؤں میں رچ بس چکی تھی. جو محب وطن تھے،

ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے. ایسے میں ہر شخص سوچ رہا تھا اب کیا ہوگا یہ ایک سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا. دن گزرتے گئے. دس اگست کا دن آ پہنچا دھماکے زوروں پر تھے. ایسے میں دارالحکومت میں صدر سے انسپکٹر اویس 'انسپکٹر بابر اور مولوی عبدالحق نے ملاقات کی - یہ ملاقات بہت خفیہ تھی. صدر صاحب رو رہے تھے. انہوں نے کہا" مجھے آج صبح دھمکی ملی ہے کہ میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ اپنے اقتدار سے الگ ہو جاؤں ورنہ ۱۴ اگست کو تمہارے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کو اڑا دیا جائے گا

انسپکٹر بابر نے کہا" سر گھبرانے کی کوئی بات نہیں انشاء اللہ ۱۳ اگست کی شام تک میں تمام مجرموں کو گرفتار کر کے آپ تک پہنچا دوں گا"

"دیکھنا بیٹو اب پوری قوم کی امیدیں تم پر ہیں. جاؤ اللہ تمہیں کامیاب کرے." صدر صاحب نے کہا.

اور پھر وہ تینوں باہر نکل آئے وہ میک اپ میں تھے. کوئی انہیں شناخت نہیں کر سکتا تھا.

□○□
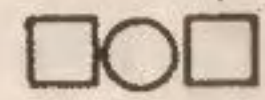
اس عرصے میں انہوں نے بہت سے کام کئے تھے. پروفیسر اپنا کام ختم کر چکے تھے. وہ کمپیوٹر کی لہروں کا توڑ دریافت کر چکے تھے. وہ آدمی بھی پکڑا جا چکا تھا. اور انہوں نے اسے قید کر کے اس کی جگہ میک اپ میں اپنا آدمی اسی جگہ لگا دیا تھا. جو کہ ان کو تسلی دیتا رہتا تھا.

اب وہ تینوں ریل گاڑی میں بیٹھے کوئٹہ جا رہے تھے. انسپکٹر اویس نے کہا" تمہیں کیسے یقین ہے وہ وہاں مل جائے گا"

"وہ وہاں ہی ملے گا اور کہیں نہیں ملے گا" انسپکٹر بابر نے کہا اس کے بعد تینوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی. تمام سفر وہ چپ رہے. گاڑی کوئٹہ ریلوے سٹیشن پر رک چکی تھی.

کوئٹہ میں ہلکی ہلکی سردی محسوس ہو رہی تھی. وہ سٹیشن سے باہر آئے اور ٹیکسی والے کو ہوٹل میں پہنچانے کا کہا. ٹیکسی والے نے جلد ہی انہیں ایک متوسط ہوٹل میں پہنچا دیا. سہ پہر ہو چکی تھی انہوں نے ہوٹل میں کمرہ لیا اور نہا دھو کر کھانا کھایا پھر وہ کافی دیر آرام کرتے رہے. شام وہ باہر نکلے ہوا میں خنکی موجود تھی. انہوں نے ہوٹل سے چائے پی اور باہر نکل آئے. کوئٹہ کے حسین نظارے ان کے سامنے تھے انہوں نے دل میں ایک کرب محسوس کیا. تینوں کی آنکھوں میں نمی اتر آئی .

مولوی عبدالحق نے ہلکی سی سسکی بھری اور کہا" اس دیس کو بچانا"

انسپکٹر بابر نے کہا" اللہ اپنا کرم کرے گا"

انسپکٹر اویس نے کہا" اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں وہ ضرور اس قوم کی توبہ قبول کرے گا."

وہ ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے رک چکے تھے تمام عمارت سنگ مرمر سے آراستہ تھی. انہوں نے کال بیل پر نظر دوڑائی.

انسپکٹر بابر نے کال بیل پر ہاتھ رکھا. دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی- تھوڑی دیر بعد ایک ملازم جو کہ وردی میں تھا آتا دکھائی دیا. اس نے پوچھا" جی کس سے ملنا ہے آپ کو"

" راحیل کو کہو کہ عدیل اور اس کے دوست آئے ہیں " اویس نے کہا

"جی اچھا" اس نے کہا اور واپس مڑ گیا.

چند منٹوں بعد وہ واپس آیا اور کہا" آئیں تشریف لے آئیں "

وہ اس کے ساتھ چل پڑے عمارت بہت شان دار تھی. تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائنگ

روم میں بیٹھے تھے. ملازم ان کے سامنے چائے رکھ کر جا چکا تھا. اچانک دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا آدمی داخل ہوا. اس نے بہترین تراش خراش کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اس کے چہرے پر نرمی اور سختی دونوں کے آثار تھے. اس نے تینوں کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا-

"جی آپ میں سے راحیل کون ہے وہ میرا کلاس فیلو تھا مگر آپ میں سے کسی کی شکل راحیل سے نہیں ملتی میں بے شک بہت دیر بعد مل رہا ہوں لیکن اسے پہچان سکتا ہوں.

انسپکٹر بابر نے کہا "م ی را نام عدیل ہے. دوست میں تمہیں بتاتا ہوں ایک تجربے کے دوران میرے چہرے پر تیزاب گر پڑا جس سے سارا چہرہ خراب ہو گیا اور پھر میں نے پلاسٹک سرجری کروالی. تم بتاؤ کیا کر رہے ہو آج کل"

"اوہ یہ سن کر بہت افسوس ہوا اچھا خیر جیسا کہ تمہیں پتہ ہے کہ مجھے فزکس میں بہت دلچسپی تھی. پاکستان سے ایم ایس سی فزکس کرنے کے بعد میں نے روس کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور پھر پی ایچ ڈی کی. میں نے فزکس کی ایک شاخ اٹامک فزکس کو چنا اور اس میں پی ایچ ڈی کی. اس کے بعد مجھے وہاں کی گورنمنٹ لیبارٹری میں ملازمت مل گئی اور اب تم تو دوست ہو اور تمہارے دوست بھی میرے دوست ہیں تم سے کیا چھپانا، میں نے وہاں تجربات کئے اور وہاں پر ایک اہم ایجاد دریافت کرنے میں کامیاب ہوا میں نے خاص لہریں ایجاد کیں جن کا نام میں نے "مرڈر ریز" یعنی "قاتل لہریں" رکھا اور انہی لہروں کا کامیاب تجربہ میں نے اس ملک میں بھی کیا ہے"

" راحیل تم نے ایسا کیوں کیا، تمہیں اس ملک نے اس مقام تک پہنچایا ہے تمہیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے. اس کے لئے کام کرنا چاہے. ایک تم ہو کہ اس کی آزادی کو غلامی میں بدلنا چاہتے ہو" عدیل نے کہا.

"ہوں" راحیل "نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اور کہا

"اس ملک نے مجھے کیا دیا، تمہیں پتہ ہی ہے کہ ماں باپ میرے بچپن میں فوت ہو چکے تھے. قدم قدم پر مجھے نفرتیں ملیں یتیم خانے والوں نے مجھے رکھنے سے انکار کر دیا میں نے کتوں کے منہ سے چھین کر روٹی کھائی ہے. اور پھر جب میں سکول میں داخل ہوا تو فیس نہ ہونے کی وجہ سے ہر ماہ میرا نام سکول سے کاٹ دیا جاتا"

جب میں نے میٹرک کیا تو پورے بورڈ میں فسٹ آیا میں نے سوچا اب تو مجھے نوکری مل جائے گی مگر مجھے ہر جگہ سے دکھ ملے. اس ملک میں جہاں رشوت ہو سفارش ہو وہاں نوکری کیسے ملتی ہے. اور پھر میں نے ایف ایس سی کیسے کی مجھے ہی پتہ ہے. پھر بی ایس سی میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آیا. حکومت نے چند طالب علم اپنے خرچہ پر اعلی تعلیم کے لئے بھیجے جن میں میرا نام بھی تھا. مگر کچھ افسروں کی ملی بھگت سے میرا نام اس لسٹ میں سے نکال دیا گیا. میں کچھ نہ کر سکا. پھر میں نے پاکستان میں ہی ایم ایس سی کی اور پیسے جوڑ تا رہا پھر میں اپنے خرچ پر روس چلا گیا. وہاں پر ان لوگوں نے میری بہت قدر کی سارا خرچہ خود اٹھایا اور میں محنت کرتا رہا. پھر میں نے اپنے ملک سے انتقام لینے کی سوچی ان لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کی. میں نے لہریں ایجاد کر لیں. اب میں اس ملک کو تہس نہس کر دوں گا. یہاں پر نیا ملک بنے گا. اس میں دوسری قومیں نہ ہونگی ایک ہی قوم ہوگی اس مقصد کے لئے میں وہاں سے آیا ہوں. اور ۱۴ اگست کو میں اپنا کام پورا کرنے کے بعد چلا جاؤں گا"

"دیکھو راحیل یار، تم مسلمان ہو اور مسلمان کا دل بہت بڑا ہوتا ہے. وہ غلطی کرنے والے کو معاف کر دیا کر... تم اس قوم کو معاف کر دو، یقین رکھو وہ سدھر جائیں گے. تم صرف ایک دفعہ انہیں معاف کر دو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اب کسی کے ساتھ

کوئی زیادتی نہ ہوگی"

"نہیں میں اس قوم کو معاف نہیں کر سکتا" راحیل نے کہا

"دیکھو اگر ایک دفعہ پاکستان مٹ گیا تو پھر قیامت تک دوبارہ نہ بن سکے گا۔ تم انگریزوں اور ہندوؤں کی ذہنیت کو نہیں جانتے انہوں نے تمہارے ذریعے اس ملک کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اور ماضی میں بھی ایسے منصوبے بنا چکے ہیں۔ مگر اللہ کی مدد سے ہم ان پر غالب آئے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے اب بھی کچھ نہیں ہوگا" مولوی عبدالحق نے کہا۔

"میں آپ کی بات سننے کو تیار نہیں" راحیل نے کہا

"ٹھیک ہے ہم چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ سن لو کہ ہم میں کوئی عدیل نہیں میرا نام انسپکٹر بابر اور ان کا انسپکٹر اویس اور مولوی عبدالحق ہے" انسپکٹر بابر نے کہا

"کیا" وہ چلایا اور پستول نکال لیا۔

"راحیل صاحب پستول چلانے کی ضرورت نہیں ہم آپ کے کلاس فیلو تھے۔ اور آپ کی آواز ہم نے اس عمارت میں سنی تو ہمیں یقین ہوگیا کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم نے آپ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ پھر آخر کار اللہ کے فضل سے آپ کو ڈھونڈ لیا ہے۔ اب پستول جیب میں رکھیں اور ہمارے ساتھ چلیں" اویس نے کہا

"کہاں؟" راحیل نے پوچھا

آپ کو دارالحکومت میں جانا ہوگا مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے بتادوں کہ ہمارے پروفیسر عبدالکریم آپ کی ایجاد کا توڑ دریافت کر چکے ہیں" انسپکٹر اویس نے کہا۔

"جب انگریز جن کے پاس بہترین سامان وہ اس کا توڑ نہیں کر سکے تو سر عبدالکریم

نے کیسے کر لیا" راحیل نے پوچھا

"یہ بس اللہ کی مہربانی سے ہوگیا ہے۔ ورنہ بندہ کس قابل ہوتا ہے۔" بابر نے کہا

"مجھے یقین نہیں آتا میں پستول چلاتا ہوں، اس کی شعاع کو ختم کر کے دکھاؤ" پھر راحیل نے ایک عجیب ساخت کا پستول نکالا اور دیوار کی طرف کر کے اس کا بٹن دبادیا۔ انسپکٹر بابر نے بھی چپٹی شکل کا پستول نکالا اور اس کا بٹن دبادیا۔ دونوں شعاعیں آپس میں ٹکرائیں اور ختم ہوگئیں۔

راحیل ہنس پڑا پھر وہ تینوں سے بغل گیر ہوا اور اس نے کہا

"واقعی مسلمان عظیم قوم ہیں۔ بشرطیکہ صرف مسلمان ہوں"

□○□
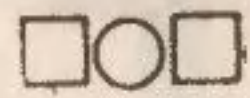
سارے ملک سے مجرم گرفتار کئے جا چکے تھے۔ اس کے ہیڈ کوارٹر کی نشان دہی راحیل نے کی۔ پورے ملک میں امن کی فضا قائم ہو چکی تھی۔ ہر پاکستانی کے چہرے پر خوشی کی لہریں محسوس ہو رہی تھیں پھر چودہ اگست کا دن آپہنچا۔ وہ مبارک دن جس طرح پاکستان ایک الگ وطن کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا تھا۔ راحیل کو معاف کر دیا گیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ صرف پاکستان کے لئے کام کرے گا۔

دوسرے تخریب کاروں کو جیلوں میں قید کر دیا گیا۔ صدر پاکستان اور دوسرے وزراء بہت خوش تھے۔ انہوں نے پاکستان کا پرچم چودہ اگست کو بلند کرتے ہوئے قسم کھائی کہ یہ پرچم ہمیشہ اونچا رہے گا۔ لوگ خوشی سے سرشار تھے۔

"امی جان ہمارے ملک میں بموں کے دھماکے کیوں ہو رہے ہیں ---" حمایت نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی والدہ سے پوچھا ---

" بیٹا۔ اس کے ذمہ دار ہم خود ہی ہیں ------"

"وہ کیسے --- ؟ حمایت حیران تھا ---

دیکھو بیٹے۔ جس قوم میں اتحاد نہیں رہتا اس کی تنزلی کا دور شروع ہو جاتا ہے پرائے اس وقت مدد نہیں کرتے بلکہ وہ مزید آگ لگانے کی کوشش کرتے ہیں. ہمارے بڑے آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور ہمارا دشمن ہمیں ہر پل نقصان پہنچا رہا ہے ... آزادی ... جس کے لئے ہم نے ان گنت قربانیاں دی تھیں ... رفتہ رفتہ ہم سے چھنی جا رہی ہے ... لیکن ہم لوگ اس حقیقت سے نگاہیں چراتے ہیں ... یہ جو ملک آگ کے دھانے پر پہنچ گیا ہے یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے ... ہم اپنے ہاتھوں سے اس سوہنے وطن کو ویران کر رہے ہیں ... اس پھول سے دیس کو تباہ کر رہے ہیں ... اور اس کی بڑی وجہ جانتے ہو کیا ہے۔؟ ایمان کی کمزوری اور اللہ تعالےٰ کی ذات سے توکل کا اٹھ جانا ہے۔ آج ہر پاکستانی کسی نہ کسی صورت میں وطن کو نقصان پہنچا رہا ہے ... منافع خور اور اسمگلر اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں مصروف ہیں ... منشیات فروش اپنے مستقبل کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں ---"

حمایت کی والدہ خاموش ہو گئیں ۔

"امی جان ۔ منشیات فروش کس طرح اپنے مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں -- ؟ حمایت نے پوچھا --- ۔

"بچے ... اور نوجوان ... کسی بھی ملک کا مستقبل ہوا کرتے ہیں ... اگر ان کی تربیت درست خطوط پر نہ کی جائے تو مستقبل کے خطرے میں پڑنے کے احکامات روشن ہو جاتے ہیں ... اگر ان لوگوں کے ہاتھوں میں کتابوں کی بجائے کلاشنکوفیں آ جائیں تو .... ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ منشیات فروش مختلف نشے نوجوانوں کی رگوں میں دوڑانے میں دن رات مصروف ہیں .... وہ لوگ اپنے آرام کے لیے وطن کے پھولوں کو مرجھانے کے لیے یہ زہر فراہم کر رہے ہیں ۔ بیٹے! جب تک ایسے لوگوں کا محاسبہ نہیں کیا جائے گا ملک کو سیدھی راہ پر کوئی طاقت نہیں لا سکتی ۔ ملک میں دھماکے اس وقت تک جاری و ساری رہیں گے جب تک تمام مسلمان ایک نہیں ہو جاتے .... ہاں بیٹے! اس وقت تک ہم پست ہوتے رہیں گے جب تک ہمارے دل ایک ساتھ نہیں دھڑکیں گے ---- " حمایت کی والدہ نے کہا --

حمایت جو بڑی توجہ سے یہ باتیں سن رہا تھا اس نے چونک کر اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔ اور دھیرے سے بولا -- : "امی ۔ آپ ' اباجان اور میں اپنے وطن کے لیے کیا کر سکتے ہیں --- ؟
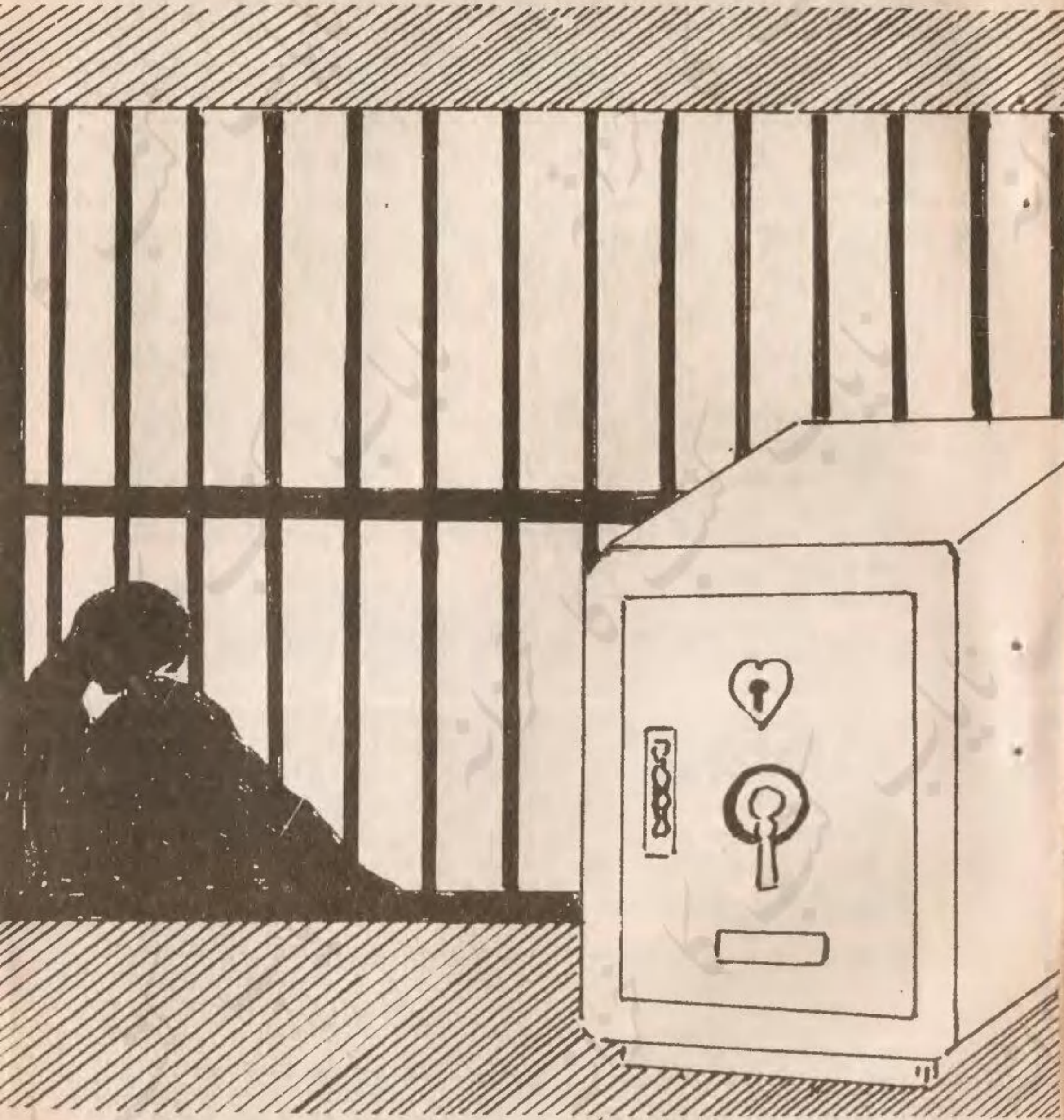
والدہ نے مسکرا کر اپنے پھول کو دیکھا اور کہنے لگیں ----:

"ہم اپنے وطن کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں... اگر ہم اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دیں گے تو یہ وطن کی خدمت ہوگی... اگر تمہارے ابا جان دفتر میں اپنا کام پوری محنت اور توجہ سے سر انجام دیتے ہیں تو جان لو کہ وہ وطن کی خدمت کر رہے ہیں... تم اگر لگن سے تعلیم حاصل کرو گے تو تم بھی وطن کی خدمت کرو گے.... میں اگر اپنے فرائض پوری دیانتداری سے ادا کروں گی تو اپنی جگہ وطن کا حق ادا کروں گی۔ اسی طرح اگر تمام پاکستانی اپنے فرائض انجام دیں گے تو وہ بھی وطن کی خدمت کریں گے... مگر بیٹے! ہماری بدقسمتی تو یہی ہے کہ ہم اپنے فرائض کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں... ہمیں اپنے حقوق پل نہیں بھولتے... اپنے حقوق کے حصول کے لیے ہم تمام اخلاقی و مذہبی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں"

"لڑائی جھگڑا کیا اچھی بات ہے امی --؟ حمایت نے ان کے خاموش ہوتے ہی پوچھا--

"ہرگز نہیں... یہ لڑائی جھگڑے ہی تو ہیں جو ہمارے ملک کو نگل رہے ہیں ----"

"تو پھر وہ اسد علی اور رحمان جھگڑتے کیوں رہتے ہیں --- ؟ حمایت نے معصومیت سے پوچھا۔

"بہت برا کرتے ہیں وہ۔ تم انہیں منع کیا کرو ----"

"کرتا ہوں لیکن وہ تو الٹا مجھ سے جھگڑنے لگتے ہیں ----"

"ہوں۔ اچھا خیر۔ چلو اٹھو اب کافی دیر ہو گئی ہے.... تمہیں صبح اسکول بھی تو جانا ہے --"

"جاتا ہوں پہلے اس سوال کا جواب تو دے دیں ----" حمایت نے جلدی سے کہا--

"کس کا ----؟"

ایک سیکنڈ میں جنت میں درخت لگوائیے

(مرسلہ: سید عبدالحمید، حیدرآباد)

حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص یہ کہے: سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ (ترجمہ) اللہ عزّ وجلّ پاک ہے عظمت والا اور تمام خوبیاں اُسی کے لیے ہیں) تو اس کے لیے جنت میں کھجور کا درخت لگا دیا جاتا ہے۔ (ترمذی شریف)

سبحان اللہ! صرف ایک سیکنڈ میں کھجور کا درخت جنت میں لگوانے کا سنہری موقع کیوں ضائع کریں۔

رانا گلزار احمد

رات کے قریبا ساڑھے بارہ بج رہے تھے -ٹائیگر قدم بڑھاتا ہوا سامنے والی گلی میں داخل ہوگیا-اچانک ایک آہٹ نے اسے چونکادیا اور وہ اپنی جگہ ٹھٹھر کر رہ گیا- چند لمحے وہ بے حد چوکنے پن سے چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا پھر اس نے سکون کی گہری سانس لی ہو محض ایک کتے کا چھوٹا سا بچہ تھا جو کوڑے کرکٹ میں مٹرگشت کر رہا تھا. ٹائیگر آگے بڑھا اور سیٹھ حسمت کی محل نما عظیم الشان کوٹھی کے سامنے رک گیا. اپنا روالور نکال کر اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر اطمینان کر لینے کے بعد دیوار پر سے چھلانگ لگا کر اندر کود گیا- کھڑکی سے روشنی کی کرنیں چھن چھن کر باہر آرہی تھیں. جس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ سیٹھ حشمت ابھی جاگ رہا ہے. وہ دبے پاؤں آہستہ آہستہ سیٹھ حشمت کے کمرے کی طرف بڑھ گیا ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اس نے دروازے کا لٹو گھمایا تو وہ حیران رہ گایا کیونکہ دروازہ مقفل نہیں تھا. اس نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگیا. کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی. کلاک کی ٹک ٹخ کے سوا ہر طرف سناٹا تھا سیٹھ حشمت ماحول سے بے خبر تجوری کے ساتھ کھڑا نوٹوں کی گڈیاں گننے میں مصروف تھا. ٹائیگر آہستہ سے آگے بڑھا اور بولا "خبردار آواز نکالنے کی جرات نہ کرنا ورنہ موت تمہارا مقدر بن جائے گی"

سیٹھ حشمت کا چہرہ سپید پڑگیا اس کا دل اب اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی. وہ خوف سے بڑبڑا "ک.... ک .... کون ہو تم"-

میں کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے. "ٹائیگر نے اپنی جیکٹ سے ایک تھیلا نکال کر سیٹھ حشمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا" جلدی سے تجوری کی ساری رقم اس میں ڈال دو".

سیٹھ حشمت نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سی تھیلا پکڑا اور تجوری میں رکھی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں اس میں ڈالنے لگا. اچانک اکے ذہن میں ایک خیال آیا کہ وہ اس ڈاکو کا حلیہ

اچھی طرح ذہن نشین کرلے تاکہ وہ بعد میں پولیس کو مجرم کہ بالکل صحیح حلیہ بتائے. یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے سامنے کھڑے ٹائیگر کے چہرے پر نظریں جما دیں. اس کے سر پر ڈارک بلیو کلر کا ہیٹ تھا تنگ پیشانی پر گھنی بھنویں' آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئیں 'بایاں رخسار سوجا ہوہ تھا. جیسے کسی نے گھونسا مارا ہو. اس کے لب نیلے اور بھنچی ہوئے اور خاکی قمیص پر سیاہ رنگ کی جیکٹ تھی. ٹائیگر کا حلیہ ذہن نشین کر لینے کے بعد سیٹھ حشمت جلدی جلدی نوٹوں کی گڈیاں بھرنے لگا. جب تک وہ تھیلے میں نوٹ بھرتا رہا وہ غور سی اس کے ہاتھوں کی حرکت و سکنات دیکھتا رہا. جب تھیلا نوٹوں سے بھر گیا- تو ٹائیگر نے کہا" لاؤ تھیلا مجھے دے دو" سیٹھ حشمت نے خاموشی سے تھیلا ٹائیگر کو دے دیا. ٹائیگر نے تھیلا جلدی سے اپنی جیکٹ میں چھپایا اور سیٹھ حشمت کا شکریہ ادا کرکے تیزی سے باہر نکل آیا. مختلف گلیوں اور سڑکوں سے ہوتا ہوا ٹائیگر اپنے گھر پہنچ گیا. اس نے اپنے کمرے کی لائیٹ جلائی نوٹوں سے بھرے ہوئے تھیلے کو الماری میں رکھا اور غسل خانے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا.

پندرہ منٹ بعد جب وہ غسل خانے سے باہر نکلا تو بالکل بدلا ہوا انسان تھا. اس کی پیشانی کشادہ ہوگئی تھی،. بائیں رخسار کی سوجن بھی غائب ہوگئی تھی. ناک کے نتھنے چھوٹے ہوگئے تھے. بھنویں پتلی ہوگئی تھیں. اوران کے پتلے ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اب اندر کی طرف دھنسی ہوئی نظر آرہی تھیں اس کے جسم پر وائٹ کلر کا سوٹ اپنی بہر دکھا رہا تھا. اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی وہ بہت صاف ستھرا اور خوبرو نوجوان نظر آرہا تھا"

شام کے قریبا پانچ بج رہے تھے. ٹائیگر اپنے کمرے میں بیٹھا ایک رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا. چند لمحوں بعد اچانک دروازے پہ زوردار دستک ہوئی جس نے ٹائیگر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اس نے رسالہ ٹیبل پر پٹخا اور دروازہ کھولا تو سامنے ریچھ کی طرف موٹا

تازہ چنگیزی مونچھوں والا انسپکٹر ریحان کھڑا مسکرا رہا تھا

" تشریف لائیے انسپکٹر صاحب ------ " ٹائیگر نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا.

انسپکٹر ریحان اندر داخل ہوتا ہوا بولے " تم مجھے دیکھ کر حیران نہیں ہوئے ٹائیگر "

" آپ جیسے مہربان کو تو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے. اور یقین جانو اس وقت بھی بہت خوشی ہو رہی ہے. " ٹائیگر نے اطمینان سے کہا-

انسپکٹر نے اپنا موٹا تازہ جسم ایک اسٹول پر منتقل کرتے ہوئی کہا " سناؤ آج کل کیسی گزر رہی ہے ------؟ "

" ہماری تو ٹھیک ہی گزر رہی ہے. انسپکٹر صاحب. آپ سنائیں آج کیسے تشریف لانے کی زحمت کی. " ٹائیگر نے پوچھا.

" ٹائیگر تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا پڑے گا " انسپکٹر ریحان نے کہا.

" کیوں خیریت تو ہے جناب ----؟

" نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے ------- آؤ میرے ساتھ " انسپکٹر ریحان نے قدرے سرد لہجے میں کہا.

انسپکٹر ریحان اور ٹائیگر آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے دونوں کے درمیان میں ایک بڑی ٹیبل حائل تھی. انسپکٹر ریحان نے کہا.

" ٹائیگر! رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب سیٹھ حشمت کو ان کے گھر میں داخل ہو کر تم نے لوٹا تھا -------؟.

" نہیں انسپکٹر صاحب ' رات تو میں اپنے گھر سے باہر ہی نہیں نکلا " ٹائیگر نے اطمینان سے جواب دیا

" اچھی طرح سوچ لو ٹائیگر ورنہ پھر بعد میں ------؟ " انسپکٹر ریحان نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا.-

" میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں!! انپسکٹر ------ اور میں تو سیٹھ حشمت کو جانتا تک نہیں کہ وہ رہتے کہاں ہیں "

ٹائیگر کے اس جواب پر انسپکٹر ریحان نے اپنے ایک کانسٹیبل کو حکم دیا " سیٹھ حشمت کو اندر بلاؤ "

کمرے میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی چند لمحوں بعد کمرے میں سیٹھ حشمت داخل ہوئے

" سیٹھ صاحب! اس شخص کو اچھی طرح پہچان لیں کیا اس آدمی نے رات آپ کو لوٹا تھا " انسپکٹر ریحان بولے

سیٹھ حشمت کی نظریں ٹائیگر کے چہرے پر جم گئیں کچھ دیر ٹائیگر کے چہرے کا بغور جائزہ لینے کے بعد سیٹھ حشمت نے کہا

" نہیں! انسپکٹر صاحب اس کے بال مجرم سے بہت مختلف ہیں اس کی پیشانی تنگ تھی. بھونیں گھنی تھیں. آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ایک گال کچھ سوجا ہوا بھی تھا. اس کے نتھنے بھی کچھ بڑے نظر آتے تھے. یہ تو انسپکٹر صاحب اس شخص سے بہت مختلف ہے. آپ پتا نہیں کس بے گناہ کو پکڑ کر لے آئے ہیں

" کیا اب آپ کا اطمینان ہوگیا انسپکٹر ----------؟ " ٹائیگر نے پوچھا

" ہاں -------- مجھے افسوس ہے ٹائیگر کہ میں نے تمہیں بلاوجہ یہاں آنے کی زحمت دی "

" اچھا اب مجھے اجازت دیں ------- خدا حافظ " ٹائیگر مسکراتا ہوا دروازہ کی طرف مڑا. ' پھر ٹھٹھک کر رہ گیا.....

ایک کانسٹیبل ہاتھوں میں وہ تمام چیزیں لیے کھڑا تھا. جو اس نے واردات کے بعد اتار کر الماری پر رکھ دیں تھیں.. ☆

روبوٹ

لفظ "روبوٹ" چیکوسلواکیہ کی زبان کے ایک لفظ "روبوٹا" سے نکلا ہے۔ . . جس کے معنی ہیں "غلام کی طرح کا"۔ یہ ایک ایسی خود کار مشین ہے جو کسی انسان کی مدد کے بغیر خود بخود حرکت کر سکتی ہے۔ اس کا دماغ ایک کمپیوٹر یا مائیکرو پروسیسر ہوتا ہے جو اس کی مشینی حرکات کو قابو میں رکھتا ہے۔ اگر انسان اسے ایک بار واضح ہدایات دے دے تو روبوٹ ان ہدایات پر عمل کرتا رہتا ہے۔

جس طرح ہمارے حواسِ خمسہ ہیں اسی طرح روبوٹ بھی کئی طرح کے الیکٹرونی حواس رکھتے ہیں . . . ٹی وی کیمروں اور ریڈار نما آلات کی مدد سے روبوٹ آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ مائکروفون جیسے آلات کی وجہ سے وہ شور یا سرسراہٹ سن سکتے ہیں۔ وہ گرمی یا سردی کا احساس بھی کر لیتے ہیں اور اب تو بعض روبوٹوں میں "سونگھنے" کی حس بھی پیدا کی جا رہی ہے۔

اصل روبوٹ بنانا کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد ہی ممکن ہو سکا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ہی ماہرین اس قابل ہوئے کہ کم جسامت کے طاقتور کمپیوٹر بنا سکیں اور ان سے دوسری مشینوں کو کنٹرول کیا جا سکے۔ پھر ایک خاص قسم کے مشینی بازو کو کمپیوٹر سے منسلک کرنے کا تجربہ کیا گیا۔ . . اس بازو میں دھات اور پلاسٹک کی کہنیاں، کلائیاں اور انگلیاں تھیں جنہیں چھوٹی چھوٹی برقی موٹروں سے حرکت دی جا سکتی تھی۔ کمپیوٹر سے ہدایات ملنے پر وہ مشینی ہاتھ کسی بھی سمت خاص زاویے سے حرکت کر سکتا تھا اور کئی طرح کے کام انجام دے سکتا تھا۔ یہ تھا حقیقی دنیا کا پہلا روبوٹ۔

روبوٹ کے تمام مشینی اعضا کی حرکت اس کے الیکٹرونی دماغ یا کمپیوٹر میں خاص زبان میں لکھی ہوئی ہدایات داخل کرنا ضروری ہے۔ کمپیوٹر ان ہدایات کے مطابق روبوٹ کے بازوؤں، کلائیوں اور انگلیوں کے جوڑوں میں چھپی ہوئی برقی موٹروں کو خاص قسم کا الیکٹرونی سگنل بھیجتا ہے کہ کب کس طرح سے حرکت کی جائے۔ یعنی پہلے انسان مشین کو سکھاتا ہے کہ کس طرح کام کیا جائے اور پھر مشین اس کی نقل کرتی ہے۔

صدف حفیظ
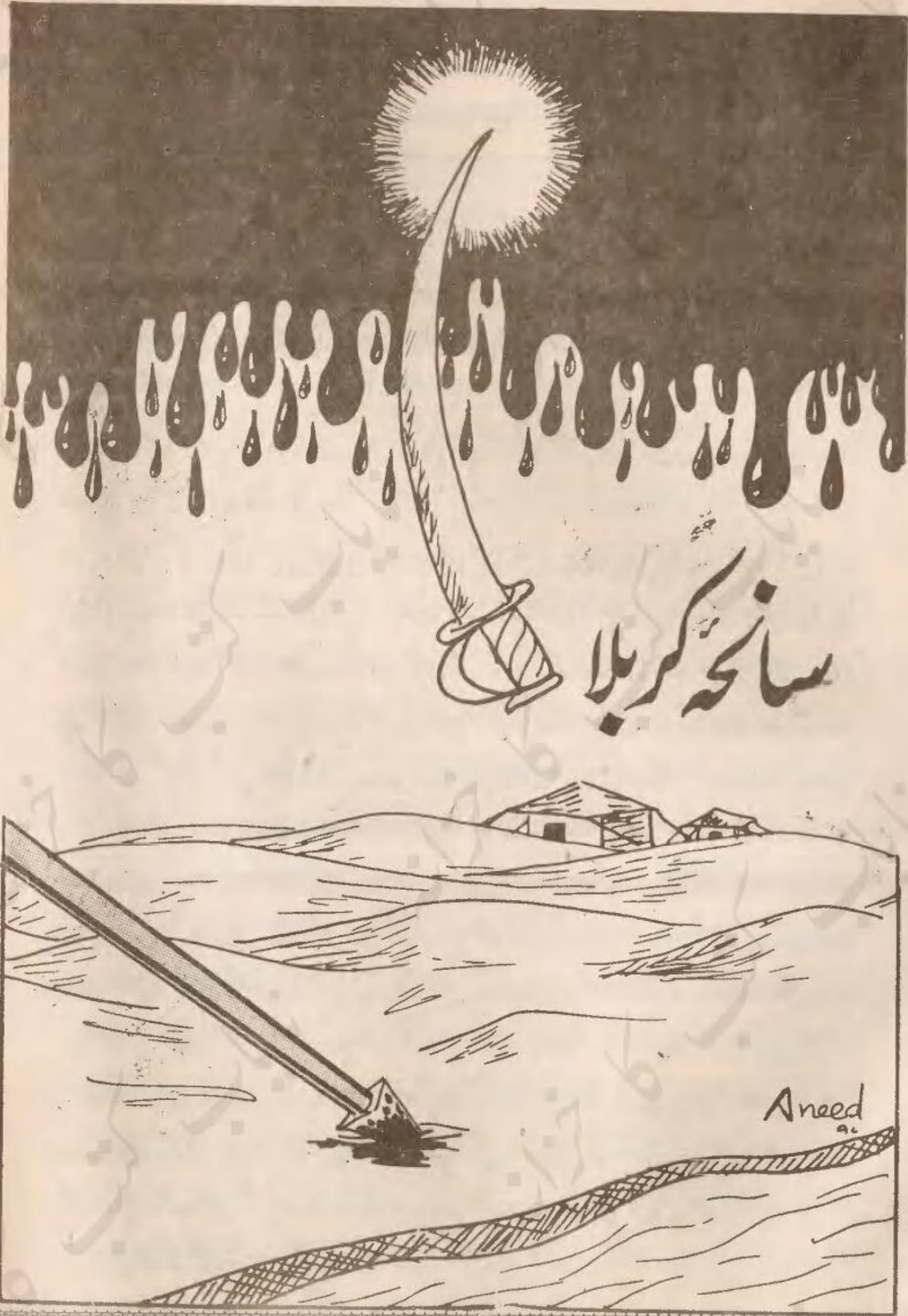
اس واقعے کا تعلق خلافت بنو امیہ سے ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافتِ بنو امیہ کے بانی تھے۔ آپ نے فتح مکہ کے دن پچیس سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ ۴۱ ہجری بمطابق ۶۶۱ عیسوی میں ساری دنیائے اسلام نے باقاعدہ طور پر آپ کو خلیفہ تسلیم کرلیا۔ اور اموی عہد خلافت کا آغاز ہوا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بیس سال کی خلافت کے بعد ستتر ۷۷ سال کی عمر میں ۲۲ رجب ۶۰ ہجری کو دمشق میں وفات پائی۔

امیر معاویہ کی زندگی میں ہی یزید کی بیعت ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ اپ کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ اس کی تربیت ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی۔ وہ موٹے اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اور سیر و شکار کا بے حد دلدادہ تھا۔ اسے شعر و شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ اور اسکے بہت سے اشعار عربی ادب میں موجود ہیں۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد یزید نے صوبائی حکام کو حکم دیا کہ تمام لوگوں سے دوبارہ بیعت لی جائے۔ ہر جگہ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ البتہ مدینہ منورہ میں چند اکابر امت ایسے تھے جنھوں نے امیر معاویہ کے عہد میں ہی یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں سے یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبد اللہ بن زبیر سے زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے اس نے ولید بن عقبہ حاکم مدینہ کو لکھا کہ ان دونوں سے فوراً بیعت لی جائے۔ ولید نے مروان بن حکم کو بلا کر مشورہ کیا اور اس کی رائے پر دونوں بزرگوں کو بلا بھیجا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ولید کے پاس آئے تو اس نے اپ کو یزید کا خط دکھایا اور بیعت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر اظہار افسوس کے بعد بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ ولید صلح جو انسان تھا۔ اس نے زیادہ دباؤ نہ ڈالا اور خاموش ہو گیا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ چھپ کر مکہ معظمہ چلے گئے اور حرم میں جا کر پناہ لے لی۔ دوسری رات حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی مکہ جا کر شعب ابی طالب میں مقیم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی مکہ پہنچ گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو دار الخلافہ قرار دیا تھا۔ اس لیے وہاں اب بھی اہل بیت کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر انہوں نے کوفہ میں سلمان بن صرد کے گھر جمع ہو کر اس بات پر اتفاق کیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں بلا کر ان کی بیعت کی جائے۔ مکہ میں اہل کوفہ کے خطوط اور وفود آپ کے پاس آنے لگے۔ اور آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلا کر کوفہ آنے کی درخواست کی اس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو تحقیق حالات کے لیے کوفہ روانہ کیا۔ ابتداء میں بڑے بڑے روسائے کوفہ اور تقریباً بارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ مسلم نے ان حالات کی خبر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دی تو آپ بہت خوش ہوئے اور کوفہ جانے کا عزم کر لیا۔

کوفہ کا حاکم نعمان بن بشیر ایک نیک دل انسان تھا۔ اس نے محض بدگمانی پر کسی سے مواخذہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یزید کو جب جاسوسوں کے ذریعے کوفہ کے حالات کا علم ہوا تو اس نے فوراً نعمان کو معزول کر کے عبید اللہ بن زیاد حاکم بصرہ کو کوفہ کی خلافت بھی سپرد کر دی۔ اس نے بصرہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پہنچنے والے قاصد کو مار کر کوفہ کی راہ لی۔ کوفہ میں اس نے لوگوں کو جمع کر کے انہیں حسین رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ کے لیے مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے کا حکم دیا۔ اور سرداروں کو امن و سکون قائم رکھنے کو کہا۔ ابن زیاد کے ان انتظامات کے پیش نظر مسلم بن عقیل کوفہ کے ایک رئیس ہانی بن عروہ کے ہاں خفیہ طور پر مقیم ہوئے۔ لیکن ابن زیاد کے جاسوسوں نے اس بات کا پتہ لگا لیا اور ہانی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ مسلم اپنے عقیدت مندوں (جن کی تعداد اٹھارہ ہزار تھی) کے ہمراہ نکلے اور ابن زیاد کے محل کو گھیرے میں لے لیا۔ ابن زیاد کے ہم مجلس شرفائے کوفہ اپنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو مسلم کے ساتھ چھوڑنے کی ترغیب دینے لگے۔
اس طرح مسلم بن عقیل کے ہمراہ صرف تیس آدمی رہ گئے۔ تب مسلم نے ایک بڑھیا کے گھر پناہ لی لیکن انعام کے لالچ میں اس کے بیٹے نے ابن زیاد کو آپ کا پتہ بتا دیا۔ ابن زیاد نے محمد بن اشعث کو آپ کی گرفتاری پر مامور کیا تھا۔ اس نے آپ کو جان کی امان کا وعدہ دے کر گرفتار کر لیا۔ مگر ابن زیاد نے وعدے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اب آپ نے ابن اشعث سے کہا کہ میری جان بچانا تمہارے بس میں نہیں لیکن تم میرے قتل کی اطلاع حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دے دینا

اور انہیں میری طرف سے کہنا کہ وہ جہاں پہنچے ہوں وہیں سے واپس چلے جائیں اور اہل کوفہ کا ہرگز اعتبار نہ کریں۔" مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد ابن اشعث نے ان کی وصیت کو پورا کیا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف قاصد روانہ کر دیا۔۔

مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کا خط ملتے ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے احباب اور خیر خواہوں کو جب معلوم ہوا تو سخت مضطرب ہوئے۔ وہ اہل کوفہ کی غداری اور بنو امیہ کی سخت گیر قوتوں سے واقف تھے۔ سب نے اس سفر کی مخالفت کی۔ آخر ۳ ذالحجہ ۶۰ ہجری کو مکہ سے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور گئے تو آپ کو اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن جعفر کا ایک خط ملا جو کہ انہوں نے مدینہ سے اپنے لڑکوں عون اور محمد کے ہاتھ روانہ کیا تھا۔ اس میں آپ کو کوفہ جانے سے روکنے کی ہدایت تھی۔ مگر آپ باز نہ آئے اور عون اور محمد کو ساتھ لے کر سفر جاری رکھا۔

جب یہ قافلہ بیضہ کے مقام پر پہنچا تو آپ کو اطلاع ملی کہ مسلم بن عقیل اور ہانی کو ابن زیاد نے علانیہ قتل کرا دیا اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آپ کو اس خبر سے بہت ملال ہوا۔ بعض خیر خواہوں نے کہا اب بھی وقت ہے۔ یہیں سے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ آپ خاموشی سے واپسی پر غور کرنے لگے مگر مسلم بن عقیل کے عزیزوں نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپ نے پیش قدمی جاری رکھی۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد بہ اختلاف روایت ۷۰، ۸۰ کے قریب تھی۔

ابن زیاد کو یزید کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی۔ چنانچہ جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مقام ذی حشم میں پہنچے تو ابن زیاد کی طرف سے حر بن تمیمی ایک ہزار فوج کے ساتھ نمودار ہوا۔ اسے حکم تھا کہ آپ کے ساتھ لگا رہے۔ اور آپ کو ابن زیاد کے سامنے پیش ہونے پر مجبور کر دے۔

نینوا کے مقام پر حر کو ابن زیاد کی طرف سے حکم ملا کہ آپ کو کھلے میدان کے سوا کہیں اترنے نہ دیا جائے اور قلعہ بند یا شاداب مقام پر ہرگز پڑاؤ کی اجازت نہ دی جائے۔

۲ محرم ۶۱ ہجری کو آپ کربلا کے میدان میں خیمہ زن ہوئے۔ اس میدان اور دریائے

فرات کے درمیان ایک پہاڑی حائل تھی۔

۳ محرم کو عمرو بن سعد بن ابی وقاص بھی چار ہزار لشکر کے ساتھ کربلا میں پہنچ گیا۔ یہ شخص حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ اس لیے آپ کے مقابلے میں آتے ہوئے اسے پس و پیش تھا۔ لیکن ابن زیاد نے اسے صوبہ رے کی حکومت کا وعدہ دیا تھا۔ اس لیے ضمیر کی آواز کے خلاف اس کام پر آمادہ ہو گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جب ابن سعد کی آمد کی خبر ہوئی تو آپ نے اس سے ملنے کی خواہش کی۔ اس ملاقات میں آپ نے تین شرائط پیش کیں کہ ان میں سے کسی ایک کو تسلیم کر لیا جائے۔

(۱) مجھے واپس جانے کی اجازت دی جائے۔

(۲) مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دیا جائے تاکہ میں جہاد میں مصروف ہو جاؤں۔۔

(۳) مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کرنے دیا جائے۔

یہ شرائط بڑی معقول تھیں۔ ابن سعد نے ابن زیاد کو لکھا۔ وہ بھی خوش ہوا مگر شمر ذی الجوشن نے سخت مخالفت کی اور کہا کہ حسین رضی اللہ عنہ اس وقت قابو میں آ چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ اب انہیں بچ کر نہ جانے دیا جائے۔ بدقسمتی سے ابن زیاد کو یہ رائے پسند آ گئی۔ ابن زیاد نے نہ صرف ان معقول شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ آل رسول ﷺ کا پانی بھی بند کر دینے کا حکم دے دیا۔

ابن سعد مصالحت کی کوشش میں لڑائی کو ٹال دیا تھا۔ ابن زیاد کو جب احساس ہوا تو اس نے ۹ محرم کو ابن سعد کو ایک تہدید آمیز خط لکھا کہ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بھیجا کہ حسین رضی اللہ عنہ کو بچاؤ۔ دیکھو میرا حکم صاف ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو حوالے کر دیں تو صحیح سالم میرے پاس بھیج دو۔ اگر انکار کریں تو خون بہاؤ۔ لاش بگاڑو کیونکہ وہ باغی ہیں۔ اور جماعت سے نکل گئے ہیں۔ ساتھ ہی ابن سعد کو معزولی کی دھمکی دے کر شمر ذی الجوشن کو بھیج دیا۔

شمر کی آمد پر ابن سعد کو منصب کی فکر ہوئی اور وہ اسی وقت جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔

البیہ کربلا ۱۰ محرم ۶۱ ہجری ستمبر ۶۸۰ عیسوی معاملہ کی نزاکت کے پیش نظر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ دشمن صرف میری جان لینا چاہتا ہے۔ اس لئے جو آدمی جانا چاہے وہ رات کی تاریکی میں چلا جائے۔ مگر سب نے پرجوش انداز میں جاں نثاری کا

اظہار کیا۔ آپ ساری رات عبادت میں مصروف رہے۔ اگلے دن صبح ۱۰ محرم ۶۱ ہجری جمعہ کے دن ابن سعد اپنی چار ہزار فوج لے کر میدان میں صف آراء ہوا۔ آپ بھی ۷۲ جاں نثاروں کو لے کر نکلے۔ ان میں ۳۲ سوار اور ۴۰ پیدل تھے۔

لڑائی سے پہلے آپ نے دعا مانگی۔ پھر آپ اونٹنی پر سوار ہو کر دشمن کی صفوں کے قریب گئے اور ایک خطبہ دیا:

"لوگو! میری بات سنو۔ جلدی نہ کرو۔ مجھے نصیحت کر لینے دو۔ اپنی آمد کی وجہ کہنے دو۔ اگر تم اسے قبول کر لو اور میرے ساتھ انصاف کرو تو یہ تمہارے لئے خوش نصیبی کا باعث ہوگا۔ لیکن اگر تم انکار کر دو تو پھر مجھے کسی بات سے بھی انکار نہیں۔ تم ایکا کر لو۔ مجھ پر ٹوٹ پڑو۔ مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا اعتماد ہر حال میں صرف پروردگار عالم پر ہے جو نیکو کاروں کا حامی ہے"

یہ الفاظ اہل بیت کے خیموں تک پہنچ رہے تھے۔ انہیں سن کر عورتیں بے اختیار ہو گئیں اور آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی۔ آپ نے فوراً عباس بن علی رضی اللہ عنہ کو کہا کہ انہیں خاموش کرائیں۔ کیونکہ ابھی انہیں بہت رونا ہے۔ اب آپ کو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ نصیحت یاد آئی جب انہوں نے بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا۔ چنانچہ بے اختیار آپ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "اے خدا ابن عباس کی عمر دراز کرے۔" اسکے بعد خطبہ کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"لوگوں! سوچو میں کون ہوں۔ خوب غور کرو۔ کیا تمہارے لئے میرا قتل کرنا جائز ہے۔ کیا میں تمہارے نبی کی لڑکی کا بیٹا اور اسکے عمزاد کا بیٹا نہیں ہوں۔ کیا تم نے رسول اللہ صلعم کا یہ مشہور قول نہیں سنا کہ آپ مجھے اور میرے بھائی کو جنت میں نوجوانوں کے سردار کہا کرتے تھے۔ اگر میرا یہ بیان سچا ہے اور ضرور سچا ہے۔ کیونکہ واللہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تو بتاؤ تمہیں برہنہ تلواروں سے میرا استقبال کرنا چاہیے۔ اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے تو ایسے صحابہ موجود ہیں جن سے تصدیق کر سکتے ہو (یہاں آپ نے کئی صحابہ کے نام لیے) وہ تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا ہے یا نہیں۔ کیا یہ بات بھی تمہیں میرا خون بہانے سے نہیں روک سکتی۔ میں تمہارے نبی کا بلاواسطہ نواسہ ہوں۔ کیا تم اس لیے مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ میں نے کسی کی جان لی ہے؟ کسی کا خون بہایا ہے؟ کسی کا مال

چھینا ہے؟ میرا قصور کیا ہے؟

سب لوگ خاموش رہے تو آپ نے ان روسائے کوفہ کے نام لئے جنہوں نے آپ کو خطوط لکھے تھے۔ اس پر وہ لوگ بول اٹھے کہ ہم نے کوئی خط نہیں لکھا۔ انہوں نے اپنا مطالبہ دہرایا کہ آپ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ مگر آپ نے فرمایا کہ مجھے ذلت گوارا نہیں۔ اس مرحلے پر حر بن یزید اپنے لشکر سے علیحدہ ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مل گیا۔ اور کہا کہ میں ہی وہ بدبخت ہوں۔ جس نے آپ جو لوٹنے سے روکا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ یہ لوگ آپ کی شرطیں منظور نہ کریں گے۔ اور اس حد تک پہنچ جائیں گے۔ میں اپنے افعال کی تلافی کے لیے آیا ہوں۔ اس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور اس کے لیے دعا فرمائی۔

اب لڑائی کا آغاز ہوا۔ ابتداء میں مبارز طلبی ہوتی رہی۔ جس میں عراقیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس پر ابن سعد نے عام حملے کا حکم دیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھوں نے بڑی جاں نثاری کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اپنی موجودگی میں آپ کے خاندان کے افراد کو میدان میں آنے نہیں دیا یہاں تک کہ ظہر تک سب شہید ہو گئے۔ اب خاندان نبوت کی باری تھی۔ سب سے پہلے آپ کے صاحبزادے علی اکبر میدان میں آئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ آپ نے ان کی لاش اٹھا کر خیمے کے پاس رکھ دی۔ اسکے بعد بنو ہاشم کے دوسرے افراد یکے بعد دیگرے شہادت سے ہم کنار ہونے لگے۔ ان میں حضرت عقیل کے خاندان سے محمد عبداللہ، عبدالرحمن، جعفر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی اولاد سے محمد عون حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد سے قاسم ابوبکر، عبداللہ، عثمان، محمد، ابوبکر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

عین اس دوران آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نومولود کو آپ کے سامنے لایا گیا اور آپ اس کے کان میں اذان دینے لگے۔ اچانک ایک تیر آیا اور بچہ کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ بچہ کی روح اسی وقت پرواز کر گئی۔ بعض روایتوں میں اس بچے کی عمر ۶ ماہ بتائی گئی ہے اور اسکا نام علی اصغر ہے اسی طرح اس بچے کے حلق میں تیر لگا۔ پیکر صبر و تحمل نے تیر حلق سے کھینچ کر نکالا۔ خون سے چلو بھر اور اسکے جسم پر ملتے ہوئے فرمانے لگے۔ "واللہ تو خدا کی نظر میں حضرت صالح کی اونٹنی سے زیادہ عزیز ہے اور حضرت محمد صلعم خدا کی نظر میں حضرت صالح سے زیادہ افضل ہیں۔ الٰہی اگر تو نے ہم سے اپنے نصرت روک لی ہے تو وہی کر جس میں بہتری ہے۔"

سب کے بعد حسین رضی اللہ عنہ کی باری تھی۔ آپ تن تنہا میدان میں کھڑے تھے۔ بے پناہ مصائب کے باوجود آپ نے نہایت حوصلہ مندی سے تلوار چلانا شروع کی۔ یہاں تک کے زخموں سے چور ہو گئے۔ اب آپ کو شدت کی پیاس لگی۔ آپ فرات کی طرف چلے مگر دشمن کب جانے دیتا تھا۔ اچانک ایک تیر آیا اور آپ کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ آپ نے تیر کھینچ لیا۔ اور واپس لوٹ آئے اب آپ بالکل نڈھال ہو چکے تھے۔ دشمن نے ہر طرف سے نرغے میں لے رکھا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو آپ بہت پہلے شہید ہو چکے ہوتے۔ لیکن کوئی شخص یہ گناہ اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔ آخر شمر نے لوگوں کو ابھارا اور چند ساتھیوں کے ہمراہ حملہ کر دیا۔ آپ کے ہاتھ اور شانے پر تلواریں پڑیں۔ ساتھ ہی سنان بن انس نے نیزہ مارا۔ آپ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ پھر اسی نے اتر کر سر کاٹ لیا۔ اسکے بعد ابن زیاد کے حکم کی تعمیل میں گھوڑے دوڑا کر نعش مبارک کو روند ڈالا۔

خاندان حسین رضی اللہ عنہ میں سے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ (امام زین العابدین) کے سوا جو اس وقت کم سن تھے اور بیمار پڑے تھے۔ کوئی مرد نہ بچ سکا۔ شمر نے خیمے میں داخل ہو کر ان کو بھی قتل کرنا چاہا۔ مگر ابن سعد نے سختی سے روک دیا۔

اہل بیت کا ستم رسیدہ قافلہ ابن زیاد کے پاس کوفہ پہنچا۔ مگر وہ اتنا شقی القلب تھا کہ خاندان نبوت کے شکستہ دل افراد سے اس حالت میں بھی بڑے گستاخانہ انداز میں پیش آیا۔ بعد میں اس قافلے کو مع حضرت حسین کے سر مبارک کے دمشق میں یزید کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ اس نے جب یہ حالات سنے اور سر مبارک دیکھا بہت رنجیدہ خاطر ہوا۔ سر دربار اس کے آنسو بہنے لگے۔ اور قاصد سے کہا کہ "حضرت حسین" کے قتل کے بغیر بھی میں تمہاری اطاعت سے خوش ہو سکتا تھا۔ ابن سمیہ (ابن زیاد پر خدا کی لعنت) واللہ اگر میں ہوتا تو حسین رضی اللہ عنہ سے درگزر کرتا۔ خدا آپ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔" قاصد کو اس نے کوئی انعام نہ دیا۔ جب لٹا ہوا قافلہ اس کے پاس آیا۔ تو اس پر رقت طاری ہو گئی۔ جب اہل بیت کی عورتیں حرم شاہی میں پہنچیں تو وہاں کہرام مچ گیا۔

یزید نے کئی روز تک اہل بیت کو عزت و احترام کے ساتھ اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ان کا جس قدر مالی نقصان ہوا تھا اس سے کئی گنا زیادہ دے کر تلافی کر دی۔ حضرت زین العابدین کو ہر روز اپنے ساتھ کھانا کھلاتا تھا۔ اس کے بعد نیک سیرت اور معتبر آدمیوں کے ہمراہ انہیں مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ ☆

"بی بی جی! یہ پودا نکال دوں۔۔۔؟" مالی نے پوچھا۔
"کون سا پودا۔۔۔؟" بیگم اشفاق بولیں۔
"یہ والا بی بی جی!" مالی نے ایک پودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ کیسا پودا ہے۔۔۔۔؟" بیگم اشفاق نے حیرت سے پوچھا۔
وہ ایک سیاہ رنگ کا پودا تھا۔۔ یہی کوئی دو فٹ کا ہوگا۔۔۔ اس کے پتے ٹہنیاں سب کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔۔ ایک ٹہنی پر ایک چھوٹا سا پھول بھی کھلا ہوا تھا۔۔۔ اس کا رنگ بھی سیاہ تھا۔
"میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا پودا کبھی نہیں دیکھا۔۔" مالی کے لہجے میں حیرت تھی۔
"تو پھر یہ آیا کہاں سے۔۔۔؟"
"بی بی جی! میں نے تو یہاں پر گیندے کے بیج اگائے تھے۔۔۔ مگر ان میں سے یہ ایک عجیب سا پودا اگ آیا ہے۔۔۔ کیا اسے نکال پھینکوں؟"
"نہیں فی الحال رہنے دو۔۔۔ دیکھیں تو سہی کہ یہ کیسا پودا بنتا ہے۔" بیگم اشفاق نے کہا۔

⁂

ڈاکٹر اشفاق احمد شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے۔۔۔ ان کا ایک بڑا ہسپتال خوب چلتا تھا۔۔۔ ہسپتال کے پیچھے ان کی ایک شاندار کوٹھی تھی۔۔۔ اس کوٹھی میں وہ اپنی بیگم اور چار بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔۔۔ فاطمہ، آمنہ، یاسر اور سارہ۔۔۔ فاطمہ نویں کلاس کی طالبہ تھی جب کہ آمنہ پانچویں اور یاسر دوسری کلاس میں پڑھتے تھے۔۔۔ سارہ ابھی سکول میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ ان کی کوٹھی کے سامنے ایک بڑا سا لان تھا۔۔۔ جو کہ بہت خوبصورتی سے سجایا اور سنوارا گیا تھا۔ اس باغ کے ایک کونے میں وہ سیاہ رنگ کا پودا دیکھا گیا تھا۔

"امی۔۔۔امی۔۔۔" آمنہ بھاگتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔
"کیا ہوا آمنہ۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔؟" بیگم اشفاق کھانا پکا رہی تھیں۔۔۔
آمنہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
"امی وہ باغ میں سیاہ رنگ کا پودا اگ آیا ہے۔۔۔"
"ہاں بیٹے مجھے پتا ہے۔۔۔ بھلا اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔۔۔؟" بیگم اشفاق نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"امی مجھے اسے دیکھ کر بہت خوف آتا ہے۔۔۔" آمنہ نے جھرجھری لی۔۔۔
"پودا ہی تو ہے۔۔۔ کوئی جن بھوت تھوڑا ہی ہے۔۔" بیگم اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔ "جاؤ جا کر کھیلو۔!"
اور پھر صرف دس دن کے اندر وہ پودا آٹھ نو فٹ کا ہو گیا تھا۔۔۔ اب تو اسے پودا کہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔۔۔ وہ پودا تو درخت بن گیا تھا۔۔۔ سیاہ رنگ کا ایک عجیب درخت۔۔۔ مالی اس درخت سے بہت پریشان نظر آتا تھا۔۔۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کو نکال پھینکا جائے۔۔۔ مگر بیگم اشفاق نے اسے ایسا کرنے سے منع کر رکھا تھا۔۔۔ وہ اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھیں کہ وہ ہے کس چیز کا درخت۔۔۔
"بی بی جی! میں آپ سے بہت سنجیدگی سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔۔۔" مالی نے ایک دن بیگم اشفاق سے کہا۔۔۔
"ہاں ہاں کہو۔۔۔!"
"آپ وہ درخت نکلوا دیں۔۔۔"
"آخر تمہیں اس درخت سے کیا پریشانی ہے۔۔۔؟" بیگم اشفاق نے حیرت سے پوچھا۔
"جی میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سیاہ رنگ کا درخت منحوس ہوتا ہے۔۔" مالی بولا۔۔۔
اس کا لہجہ پریشان کن تھا۔
"یہ فضول باتیں ہیں۔۔۔"

"نہیں بی بی جی!۔۔۔ بزرگ یہی کہتے ہیں کہ جہاں سیاہ رنگ کا کوئی پودا یا درخت اُگ آئے ۔۔۔اس گھر پر پریشانیاں نازل ہو جاتی ہیں۔۔۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اِسے کٹوا دیں۔۔۔"

"ابھی تک تو اس نے کچھ نہیں کہا۔۔" بیگم اشفاق نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔۔ وہ ایسے وہموں پر بالکل یقین نہیں رکھتی تھیں۔۔۔۔

"آپ دیکھ لیں کہ میں نے اس کیاری میں گیندے کے جتنے بھی بیج لگائے تھے۔۔ ان میں سے ایک بھی نہیں اُگا۔۔۔ اس کیاری میں صرف ایک یہ منحوس درخت اُگ آیا ہے۔۔" مالی نے بتایا۔۔۔

"اچھا۔۔؟" بیگم اشفاق کے لہجے میں حیرت تھی۔۔۔ وہ مالی کے ساتھ اس کیاری کی طرف گئیں۔۔۔ واقعی وہاں گیندے کے سب پودے مرجھائے ہوئے تھے۔

"حیرت ہے۔۔۔ تم نے پانی اور کھاد وغیرہ تو ٹھیک دیا تھا نا۔۔۔؟"

"جی بی بی۔۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال بھی اسی کیاری میں گیندے کے پودے اُگے تھے اور خوب پھول لگے تھے۔۔" مالی نے یاد دلایا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔۔۔۔ بیگم اشفاق اب بھی گیندے کے مردہ پودوں کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔

"تو کیا اب مجھے اجازت ہے کہ اس درخت کو کاٹ دوں؟" مالی نے پوچھا۔

"نہیں ابھی کچھ دن اور دیکھنے دو۔۔" بیگم اشفاق نے کہا۔

"جی بہتر۔۔!" مالی خاموش ہو گیا۔۔۔

بیگم اشفاق پھر واپس کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔۔۔ قریباً پندرہ یا بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ یاسر دوڑا دوڑا اندر آیا۔۔۔

"امی وہ مالی باغ میں بے ہوش ہو گیا ہے۔۔"

"کیا۔۔!" بیگم اشفاق کے منہ سے نکلا۔۔۔ اور وہ باغ کی طرف بھاگیں۔۔۔

مالی واقعی بے ہوش پڑا تھا۔۔۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔۔۔ بیگم اشفاق نے دیکھا

کہ مالی کے پاس ہی ایک کلہاڑی پڑی ہوئی تھی۔۔۔ وہ اس سیاہ درخت کے بالکل قریب گرا پڑا تھا جسے وہ کچھ دیر پہلے منحوس کہہ رہا تھا۔۔۔

*

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔۔۔

بیگم اشفاق ٹیلی فون کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔

"ہیلو۔۔!" انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ہیلو بیگم۔۔!" دوسری طرف ڈاکٹر اشفاق تھے۔۔۔

"جی آپ ہیں۔۔۔ بتائیں مالی کا کیا حال ہے۔۔۔؟" بیگم اشفاق نے پوچھا۔

"بیگم افسوس ناک خبر ہے۔۔۔۔ مالی انتقال کر گیا ہے۔۔۔"

"کیا۔۔!!" بیگم اشفاق کا رنگ اڑ گیا تھا۔۔۔ آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔۔۔۔ انہیں مالی کے وہ فقرے یاد آرہے تھے جن میں اس نے اس درخت کو منحوس کہا تھا۔۔۔

"جہاں سیاہ درخت اُگ آئے وہاں پریشانیاں نازل ہو جاتی ہیں۔۔۔"

"ہم نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر اللہ کو یہی منظور تھا" دوسری طرف سے ڈاکٹر اشفاق کی آواز آرہی تھی۔

"آخر اسے ہوا کیا تھا۔۔؟" بیگم اشفاق نے سوال کیا۔

"ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔۔ ہم نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی ہے۔ رپورٹ موصول ہو گی تو کچھ کہہ سکیں گے۔۔۔"

ٹیلی فون سننے کے بعد بیگم اشفاق باغ کی طرف گئیں۔۔۔۔ سیاہ درخت ہوا سے لہرا رہا تھا۔۔۔ سیاہ پتے ہلتے ہوئے عجیب سے لگ رہے تھے۔۔۔ انہوں نے ایک جھرجھری لی۔۔۔ اور نظریں اس سے ہٹا لیں۔۔۔ باغ میں یاسر اور سارہ کھیل رہے تھے۔

"یاسر! سارہ! فوراً اِدھر آجاؤ۔۔" بیگم اشفاق نے چلّا کر کہا۔

وہ بھاگتے ہوئے امیّ کے پاس آگئے۔

"آئندہ تم لوگ باغ میں بالکل نہیں جاؤ گے۔۔۔ بس گھر میں ہی کھیل لیا کرو۔۔"

"مگر کیوں امیّ . . . ؟" فاطمہ نے کہا، وہ بھی امیّ کی آواز سن کر باہر آگئی تھی . . .
"بس مجھے لگتا ہے کہ یہاں کوئی خطرہ ہے . . ."
"امیّ کیا آپ اس درخت کی وجہ سے کہہ رہی ہیں . . . ؟" فاطمہ نے پوچھا۔
"ہاں !" ان کا جواب مختصر تھا۔
"مجھے تو یہ درخت پہلے ہی بہت بُرا لگتا ہے . . . نہ جانے اسے دیکھ کر کیوں ڈر سا محسوس ہوتا ہے . . ." فاطمہ نے سیاہ درخت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

٭

رات کے کھانے پر وہ سب میز پر موجود تھے . . .
"آپ کو پتا ہے . . . مالی آج صبح سیاہ درخت کو منحوس کہہ رہا تھا . . . وہ اپنے آباؤ اجداد کا حوالہ بھی دے رہا تھا . . ." بیگم اشفاق نے ڈاکٹر اشفاق سے کہا . . .
"میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اسے کٹوا دو . . . مگر تمہیں ہی شوق تھا اسے پالنے کا . . . بھلا اس سے کیا خوبصورتی پیدا ہوگی . . ." ڈاکٹر اشفاق نے نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے کہا۔
"اور مالی بھی اسی درخت کے قریب بے ہوش ملا تھا۔"
"اچھا۔ !"
"ہاں۔ ! اور اس کے قریب ایک کلہاڑی بھی پڑی تھی . . . میرا خیال ہے کہ وہ مزدور اس درخت کو کاٹنے کا ارادہ رکھتا تھا . . . مگر نہ جانے کیوں بے ہوش ہوگیا . . . ؟" بیگم اشفاق نے بتایا . . .
"ابو کہیں درخت نے تو نہ کچھ دیا ہو۔ ؟" یاسر نے خیال ظاہر کیا . . .
"نہیں بیٹے۔ ! یہ پودے، درخت سوچ نہیں رکھتے . . ." ڈاکٹر اشفاق بولے۔
"لیکن ابو ! یہ کوئی عام درخت نہیں ہے . . ." فاطمہ نے کہا۔
"بیٹا . . . میں مانتا ہوں کہ پہلے ایسا درخت ہم نے نہیں دیکھا . . . مگر ہوسکتا ہے کہ کسی اور علاقے میں ایسے درخت عام ہوں۔"
"مگر یہ یہاں کیسے اُگ گیا . . . ؟" آمنہ نے پوچھا . . .

"ہوسکتا ہے کہ غلطی سے گیندے کے بیجوں میں اس کا بھی بیج آگیا ہو۔ اور مالی کو پتا بھی نہیں چلا ہو۔"
"میں چاہتی ہوں کہ اسے جلد سے جلد کٹوا دیا جائے۔" بیگم اشفاق نے درمیان میں کہا . . . "آپ کل ہی کوئی آدمی بھیج دیں۔"
"ٹھیک ہے میں کل کوئی بندوبست کرتا ہوں . . ." ڈاکٹر اشفاق نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا . . .

٭

صبح ہی صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی . . .
"یہ اس وقت کس کا فون آگیا . . . ؟" ڈاکٹر اشفاق نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"خدا خیر کرے . . ." بیگم اشفاق گھبرا گئی تھیں . . .
"ہیلو۔ !" ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور اٹھا لیا تھا . . .
"ہاں میں ہی ہوں . . . ہاں کہو . . . اچھا۔ ؟ حیرت ہے . . . ہوں . . .
وہ اسی طرح کچھ منٹ تک فون سنتے رہے . . . ریسیور رکھتے وقت ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے . . .
"کس کا فون تھا . . . ؟"
"میرے دوست ڈاکٹر زبیر کا . . ."
"کیا کہہ رہا تھا۔ ؟"
"اسے ہی میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے مالی کی لاش بھیجی تھی۔" ڈاکٹر اشفاق کا لہجہ دھیما تھا . . .
"تو پھر۔ ؟"
"وہ کہتا تھا کہ میں نے رات ہی پوسٹ مارٹم مکمل کر لیا تھا مگر بہت دیر ہونے کی وجہ سے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ مالی کی موت زہر سے ہوئی ہے۔"
"کیا۔ !!" بیگم اشفاق کا رنگ اڑ گیا تھا . . .

"ہاں! ایسے زہر سے جس نے چند منٹ میں مالی کے جسم میں موجود خون کے خلیے تباہ کر دیے۔"
"اُف۔!"
"اس کا کہنا ہے کہ زہر کو وہ شناخت نہیں کر پایا۔۔۔ کیونکہ ایسا زہر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ خون کے خلیوں کو تباہ کرنے والے تو اور بھی بہت سے زہر ہیں۔۔۔ مگر وہ سب معلوم ہیں جب کہ یہ زہر پہلی دفعہ دیکھا گیا ہے۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے تفصیل سے بتایا۔
"مگر مالی کو زہر کس نے دے دیا۔؟" بیگم نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔۔۔ زہر مالی کے پاؤں سے پھیلا ہے۔"
"پاؤں سے؟"
"ہاں۔ اس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ایک کانٹا نکلا ہے۔۔۔ ڈاکٹر زبیر کے مطابق یہ کانٹا انتہائی زہریلا ہے۔۔" ڈاکٹر اشفاق بولے۔
"یہ کیسا کانٹا ہے۔۔۔؟"
"ڈاکٹر زبیر کہتے ہیں کہ یہ کسی پودے کا ہے۔۔۔ اور کانٹے کا رنگ بالکل سیاہ ہے۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے سنجیدگی سے بتایا۔
بیگم اشفاق کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔۔۔ آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئی تھیں۔۔۔ اور وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھیں۔ ان کے ذہن میں سیاہ کانٹا کر رہا تھا۔۔۔

☆

سیاہ درخت اب پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔۔۔ اس کے ارد گرد قریباً دو فٹ تک انتہائی خار دار جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔۔۔ یہ تین فٹ تک اونچی تھیں۔۔۔ اس سے یہ ہوا تھا کہ کوئی اب درخت کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔۔۔ بچوں میں سے اب کوئی بھی باغ میں نہیں آتا تھا۔۔۔ مالی کی موت کو اگرچہ چار دن گزر چکے تھے مگر اس گھر پر ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔۔۔۔ اور آج تو وہ آدمی بھی آ رہا تھا جسے اس درخت کو کاٹنے کے لیے بلایا گیا تھا۔۔۔ بیگم اشفاق اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔۔۔
۔۔۔ دن کے گیارہ بجے کے قریب باہر کی گھنٹی بجی۔۔۔ آنے والا وہ آدمی ہی تھا۔۔۔ اس

کے پاس ایک بڑی آری اور کلہاڑی کے علاوہ کچھ چھوٹا موٹا اور سامان بھی تھا۔۔
"بیگم صاحبہ! درخت کون سا ہے؟" اس نے پوچھا۔۔۔
"وہ والا۔۔۔" بیگم اشفاق نے اشارہ کیا۔۔۔
وہ خود باہر آ گئی تھیں۔۔۔
اس آدمی نے بڑی حیرت سے درخت کی طرف دیکھا۔۔۔
"کمال ہے۔ بہت عجیب درخت ہے۔۔۔"
"تمہیں کچھ چاہیے تو نہیں۔ ؟"
"جی نہیں۔۔۔ میں سب سامان لے کر آیا ہوں۔۔۔"
بیگم اشفاق گھر کے اندرونی حصے کی طرف مڑ گئیں۔۔۔
فاطمہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے باغ میں اس آدمی کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔ وہ درخت کے قریب پہنچ کر کچھ دیر تک حیرت سے دیکھتا رہا۔۔۔ لگتا تھا کہ وہ فیصلہ کر رہا ہے کہ درخت کو کیسے کاٹے۔۔۔
پھر اس نے کلہاڑی اٹھائی اور جھاڑیوں کے ادھر سے اسے درخت تک پہنچانے کی کوشش کی۔۔۔ مگر درخت زیادہ فاصلے پر تھا۔۔۔ کلہاڑی ایک طرف رکھ کر اس نے آری اٹھائی اور اس کا رخ درخت کی طرف کیا۔۔۔ آری خاصی بڑی تھی۔۔۔ وہ آسانی سے درخت تک پہنچ گئی۔۔۔ اس نے آری کے دستے کو مضبوطی سے پکڑا اور لگا اسے چلانے۔۔۔
وہ کچھ دیر تک یونہی آری چلاتا رہا۔۔۔ مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ درخت پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ اس نے آری روک لی اور حیرت سے کبھی آری کو اور کبھی درخت کو دیکھتا تھا۔
فاطمہ بھی حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔۔۔ اس شخص نے باغ کے کونے سے بانس کا ٹکڑا لیا اور اسے کلہاڑی کے دستے سے باندھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک لمبی سی کلہاڑی تیار تھی۔۔۔ یہ اب آسانی سے درخت تک پہنچ سکتی تھی۔۔۔ درخت سے کچھ اور پرے کھڑے ہو کر اس نے کلہاڑی سے درخت کا نشانہ لیا۔۔۔
ٹھک۔! پہلی زوردار ضرب پڑی درخت پر۔

ٹھک ۔! دوسری

ٹھک ۔! تیسری

ضربوں کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا... مگر درخت کو کچھ نہیں ہو رہا تھا...

اچانک فاطمہ نے ایک انتہائی حیران کن منظر دیکھا... درخت کی وہ شاخیں جو اس آدمی کے اوپر تھیں... ان میں سے ایک شاخ آہستہ آہستہ نیچے کو جھک رہی تھی۔

پہلے تو فاطمہ کو لگا کہ اسے وہم ہوا ہے... مگر اب وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ شاخ اس شخص کے سر کے بالکل قریب پہنچ گئی ہے... وہ شخص برابر ضربیں لگانے میں مصروف تھا...

وہ شاخ اس شخص کے سر سے ٹکرائی... اور اگلے ہی لمحے وہ آدمی گر چکا تھا... فاطمہ کے دیکھا کہ وہ بالکل ہل جُل نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔

اس کی نظر درخت پر پڑی... وہ شاخ اپنی جگہ پر واپس جا چکی تھی...

فاطمہ وہاں سے بھاگی...

"امّی! امّی!" وہ چیخ رہی تھی....

"کیا ہوا ۔" امّی جلدی سے ایک کمرے میں سے نکلیں... سامنے سے آتی ہوئی فاطمہ ان سے ٹکرا گئی تھیں...

"وہ... وہ" فاطمہ باہر کی طرف اشارہ کر رہی تھی...

بیگم اشفاق گھبرا گئیں... وہ فوراً باغ کی طرف بھاگیں۔ فاطمہ بھی ساتھ ہی تھی...

درخت سے وہ دور ہی رک گئی تھیں... وہ آدمی ان کے سامنے ہی پڑا تھا... بیگم اشفاق نے غور سے اسے دیکھا... اس کا سانس بھی نہیں چل رہا تھا...

ان کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں... انہوں نے درخت کی طرف دیکھا... دھوپ میں وہ چمکتا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا... اس کے پاس جھاڑیوں میں کلہاڑی اٹکی ہوئی تھی۔

☆

"آپ نے سنا فاطمہ کیا بتا رہی ہے...؟" بیگم اشفاق نے ڈاکٹر اشفاق سے کہا۔

"ہاں ہاں سنا ہے... میرا خیال ہے اسے وہم ہوا ہے... بھلا کسی درخت کی شاخ خود بخود کسی پر حملہ کیسے کر سکتی ہے۔؟"

ڈاکٹر اشفاق نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا... وہ رات گئے ہسپتال سے واپس آئے تھے...

"نہیں ابو! میں سچ کہہ رہی ہوں... آپ یقین کریں..!" فاطمہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا...

"بیٹے ۔ ڈر گئی ہو شاید" ڈاکٹر اشفاق کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی...

"آپ نے اس درخت کے بارے میں کیا سوچا...؟ اب تو یہ دو اموات کا ذمے دار بن چکا ہے... بیگم اشفاق نے پوچھا۔

"بیگم سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں ۔ اب میں کسی اور کو اسے کاٹنے کے لیے نہیں بلا سکتا۔ ہاں! آج میرے پاس علاج کے لیے زرعی یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر آئے تھے... میں نے ان سے اس درخت کا بھی ذکر کیا تھا۔ انہوں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی تھی... وہ شاید کل اسے دیکھنے کے لیے آئیں۔ میں ان سے بات کروں گا کہ کوئی تدبیر کی جائے۔ اسے تباہ کرنے کی" ڈاکٹر اشفاق نے بتایا۔

"آگ لگا کر کیوں نہ دیکھیں ۔؟" بیگم اشفاق نے تجویز ظاہر کی...

"نہیں بیگم کسی قسم کا اور کوئی تجربہ میں نہیں کرنے دوں گا، پہلے مجھے ان ڈاکٹر سے بات کر لینے دو... ڈاکٹر اشفاق نے لحاف اوڑھتے ہوئے کہا۔

ٹرن... ٹرن... ٹرن...

ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی... ڈاکٹر اشفاق کی آنکھ کھلی تھی...

انہوں نے وقت دیکھا رات کے اڑھائی بجے تھے...

"ہیلو ۔؟" انہوں نے کہا۔

مگر دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

"ہیلو ۔ ہیلو ۔"

مگر وہی خاموشی۔۔۔

ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور واپس رکھ دیا۔۔۔

انہیں دوبارہ سوئے پانچ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔۔۔

"ہیلو۔!"

مگر دوسری طرف پھر خاموشی تھی۔۔۔

"کون بدتمیز ہے۔" ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور پٹخ دیا۔

۔۔۔ اور پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔۔۔ اِدھر وہ ریسیور رکھتے اور اُدھر گھنٹی بج اُٹھتی۔۔۔

"آخر یہ کس کا فون بار بار آرہا ہے۔؟" بیگم اشفاق کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔۔۔

"پتا نہیں کون ہے بیگم۔ تنگ کر رہا ہے۔" ڈاکٹر اشفاق نے غصے سے کہا۔

اور پھر انہوں نے ریسیور کریڈل پر نہیں رکھا بلکہ ایک نمبر گھما کر ساتھ تپائی پر رکھ دیا۔۔۔

پندرہ منٹ مزید گزرے ہوں گے کہ پھر گھنٹی بج اٹھی۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق پھر نیند سے اٹھے تھے۔۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔ مَیں نے تو ریسیور اٹھا کر رکھ دیا تھا۔۔" انہوں نے سوچا۔۔۔

گھنٹی پھر بجی۔۔۔ مگر اب انہوں نے غور کیا تو پتا چلا کہ باہر کی گھنٹی بج رہی تھی۔۔۔

بیگم اشفاق اور بچے بھی اٹھ گئے تھے۔۔۔۔

"یہ اس وقت کون ہوسکتا ہے۔؟" بیگم اشفاق حیران تھیں۔

"پتا نہیں۔ جاکر دیکھنا ہوگا۔۔" ڈاکٹر اشفاق کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔۔۔

"خدا خیر کرے۔ ذرا دیکھ کر جائیے گا۔" بیگم اشفاق نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔؟"

"وہ۔۔۔ درخت۔!"

"بیگم کیا درخت خود چل کر میری طرف آئے گا۔۔۔؟"

ڈاکٹر اشفاق باہر کی طرف گئے تھے۔ ساتھ وہ پستول لے جانا نہیں بھولے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی ان کی واپسی ہوئی۔۔۔

"کون تھا۔؟"

"کوئی بھی نہیں بیگم۔! میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔۔۔ خدا جانے۔۔۔ اس وقت کسے تنگ کرنے کی سوجھی تھی۔"

☆

ڈاکٹر اشفاق ایک اور آدمی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے۔۔۔ بیگم اشفاق نے دیکھا وہ قریباً ساٹھ سال کا ہوگا۔۔۔ دبلا پتلا سا۔ سَر پر بہت کم بال تھے۔۔۔ ڈاڑھی بھی تھی جس میں سفید اور سیاہ دونوں رنگوں کے بال نظر آرہے تھے۔۔۔

ڈاکٹر اشفاق اسے لے کر سیدھے درخت کی طرف بڑھے۔۔۔ بیگم اشفاق باغ کے قریبی کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔۔۔ ان کی آوازیں بھی صاف آرہی تھیں۔

"مَیں نے بھی کبھی ایسا درخت نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں نے ساری عمر پودوں اور درختوں پر تحقیق کرتے ہوئے گزاری ہے۔" وہ شخص کہہ رہا تھا۔

"ڈاکٹر نیازی تو پھر یہ اُگ کیسے آیا یہاں۔؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا۔

"واقعی یہ بات سوچنے والی ہے۔۔۔ اس پر تحقیق کرنی پڑے گی۔۔۔ مگر آپ بتا رہے تھے کہ اس کا کوئی حصہ ٹوٹتا نہیں ہے۔۔۔ اور یہ زہریلا بھی بہت ہے۔۔۔"

"جی ہاں۔!"

"مگر جو کانٹے مرنے والوں کے جسم سے نکلے تھے وہ کہاں ہیں۔؟" ڈاکٹر نیازی نے اچانک سوال کیا۔

"وہ زہر پر تحقیق کے دوران استعمال ہوگئے۔۔۔"

"تو کیا کوئی پتّا بھی نہیں ٹوٹتا۔؟"

"توڑ کر نہیں دیکھا کہیں زہر نہ چڑھ جائے۔" ڈاکٹر اشفاق نے بتایا۔

"یہ تو اونچا بھی خاصا ہے۔۔۔" ڈاکٹر نیازی نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

درخت اب قریباً بارہ فٹ سے بھی اونچا جا چکا تھا۔ اس کی کچھ شاخیں قریب سے گزرنے والی ٹیلی فون اور بجلی کی لائنوں سے بھی لپٹی ہوئی تھیں۔۔۔

"میرا خیال ہے، میں اس کا کوئی پتا توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔۔" ڈاکٹر نیازی نے

درخت کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔۔۔

"نہیں۔۔۔ آپ ایسا نہ کریں۔" ڈاکٹر اشفاق نے ڈاکٹر نیازی کا بازو پکڑ لیا۔۔۔

"آخر تحقیق بھی تو کرنی ہے۔۔۔ ڈاکٹر نیازی نے کہا۔۔۔

"آپ۔۔۔۔" ڈاکٹر اشفاق کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ ان کی نظر جھاڑیوں کے ایک کنارے کی طرف تھی۔۔۔

"اب پتا توڑنے کی ضرورت نہیں۔" وہ آہستہ سے بولے۔

"کیوں۔۔؟" ڈاکٹر نیازی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا جدھر ڈاکٹر اشفاق دیکھ رہے تھے۔۔۔

وہاں جھاڑیوں کے پاس ایک سیاہ رنگ کا پتّا پڑا تھا۔ جو کہ یقیناً درخت سے ٹوٹ کر گرا تھا۔۔۔

ڈاکٹر نیازی فوراً اس پتے کی طرف بڑھے۔۔۔

"ٹھہریں۔ اس طرح نہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ یہ زہریلا ہو۔ کسی چیز کی مدد سے اِسے اٹھاتے ہیں۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔

پھر کاغذ کے ایک ٹکڑے کی مدد سے اسے اٹھا کر ایک شیشے کی بوتل میں ڈال دیا گیا۔۔۔

"میں اسے آج ہی زرعی یونیورسٹی کی تحقیقی لیبارٹری میں پہنچا دیتا ہوں۔۔۔ جلد ہی رپورٹ آجائے گی کہ یہ درخت کیا ہے۔؟" ڈاکٹر نیازی نے شیشے کی بوتل ایک تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔۔۔

"مگر سب سے ضروری یہ ہے کہ اس درخت کو ختم کیسے کیا جائے۔۔" ڈاکٹر اشفاق بولے۔

"جب درخت کے بارے میں معلوم ہو جائے گا تو اسے ختم کرنے کے لیے بھی کچھ سوچنے میں آسانی ہو گی۔۔۔"

☆

یاسر سو کر اٹھا تھا۔۔۔ شام کا وقت شروع ہو چکا تھا۔۔۔ اس کے ابو آج دوپہر کے بعد ہسپتال نہیں گئے تھے۔۔۔ ان کی طبیعت آج ٹھیک نہیں تھی۔۔۔

اس وقت وہ برآمدے میں بیٹھے کسی رسالے کے مطالعے میں مصروف تھے۔۔۔۔

یاسر اٹھ کر سیدھا برآمدے کی طرف بڑھا۔ ابو کی کرسی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔۔۔

اچانک اس کا ہاتھ اٹھا۔۔۔ اور پوری قوت کے ساتھ اس کے ابو کے منہ کی طرف گیا۔

"تڑاخ!"

تھپڑ کی آواز گونجی۔

"یاسر۔۔!" ڈاکٹر اشفاق کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔

"تڑاخ۔۔!" ہاتھ تیزی سے دوبارہ اٹھا تھا۔

"یاسر۔۔!" ڈاکٹر اشفاق غصّے میں آ گئے تھے۔۔۔ اور انہوں نے ایک تھپڑ یاسر کے منہ پر لگایا۔۔۔

یاسر کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔۔۔ نہ وہ کچھ منہ سے کہہ رہا تھا۔۔۔

ڈاکٹر اشفاق کے چہرے پر پھر حیرت کے آثار آ گئے تھے۔۔۔

"یاسر۔۔! تمہیں کیا ہوا ہے۔۔۔؟" ان کے لہجے میں نرمی تھی۔۔۔

وہ خاموش سرخ آنکھوں سے اپنے ابو کو گھور رہا تھا۔

اتنے میں بیگم اشفاق بھی برآمدے میں آ گئیں۔۔۔

"میرے بیٹے۔۔۔" وہ گھبرا کر یاسر کی طرف بڑھیں مگر اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر رک گئیں۔

"یہ۔۔۔ یہ اس کی آنکھیں دیکھیں ذرا۔۔" بیگم اشفاق کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔۔۔

"میرے بچے۔۔۔" انہوں نے آگے بڑھ کر یاسر سینے سے لگا لیا۔۔۔

یاسر نے ایک زوردار تھپڑ اپنی امّی کے منہ پر بھی مار دیا۔۔۔

امّی کے چہرے پر حیرت تھی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔۔۔

اچانک اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔۔۔ اور وہ بے ہوش ہو کر اپنی امّی کے بازوؤں میں جھوم گیا۔۔۔

"یاسر۔۔!" امّی چیخی تھیں۔۔۔

ڈاکٹر یاسر کو ہوش میں لانے کی کوششوں میں مصروف تھے، مگر ابھی تک ان کی کوششیں بے سود ثابت ہوئی تھیں۔ بیگم اشفاق برابر روئے جا رہی تھیں... یاسر کی بہنیں بھی رو رہی تھیں۔ ڈاکٹر اشفاق یاسر کے پاس موجود تھے...

آخر تین گھنٹے کی کوششوں کے بعد اسے ہوش آیا... بیگم اشفاق اور یاسر کی بہنیں بھاگ کر ہسپتال کے کمرے میں داخل ہوئیں... وہ بستر پہ خاموش لیٹا ہوا تھا... اور چھت کو رہا تھا... ڈاکٹر اشفاق قریب کھڑے پریشان نظروں سے یاسر کو دیکھ رہے تھے...

"یاسر... میرے بیٹے!" بیگم اشفاق بھاگ کر اس سے لپٹ گئیں...

مگر یاسر اسی طرح پڑا رہا... اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا...

"یاسر ہوش میں تو آ گیا ہے مگر ابھی تک کچھ بول نہیں پا رہا..." ڈاکٹر اشفاق نے دھیرے سے کہا...

بیگم اشفاق رونے لگیں:

"مالی صحیح کہتا تھا... سیاہ درخت منحوس ہوتا ہے۔" بیگم اشفاق نے روتے ہوئے کہا...

یاسر اسی طرح پلکیں جھپکائے بغیر چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

☆

یاسر کو وہ گھر لے آئے تھے... وہ اب بھی خاموش تھا... کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا... اور نہ ہی اس کے چہرے پر کوئی تاثر تھا... بیگم اشفاق روتی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر اشفاق بھی پریشان تھے... رات دس بجے کے قریب ڈاکٹر اشفاق نے یاسر کو نیند کا ٹیکا لگایا تھا... اور وہ سو گیا تھا... باقی سب بھی اپنے بستروں پر لیٹ گئے تھے... نیند کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔

اسی خاموشی میں ٹیلی فون کی گھنٹی نے سب کو چونکا دیا... ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔!"

مگر دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئی...

"لگتا ہے کل والے شخص نے پھر تنگ کرنا شروع کر دیا ہے..." ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا...

باقی خاموش رہے...

کچھ دیر کے بعد پھر گھنٹی بجی

ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور اٹھا کر بہت زور سے 'ہیلو' کہا، مگر دوسرا لمحہ ان کے لیے زندگی کا سب سے حیران کن لمحہ تھا... دوسری طرف سے ہیلو کی آواز آئی...

مگر یہ کیا... یہ ہیلو ان کی اپنی زبان میں تھا...

"کون ہو تم...؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا...

"کون ہو تم۔؟" دوسری طرف سے بھی یہی دہرایا گیا... اور بالکل ڈاکٹر اشفاق کی آواز میں...

"کون بدتمیز ہے۔؟" وہ چلائے...

"کون بدتمیز ہے۔؟" دوسری طرف سے آواز آئی...

ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور پٹخ دیا...

"کون تھا۔؟" بیگم اشفاق نے پوچھا۔

"بیگم! پتا نہیں کون ہے... میری ہی آواز بنا کر بول رہا تھا۔"

تیسری دفعہ گھنٹی بجنے پر ڈاکٹر اشفاق نے غصے سے ریسیور اٹھایا...

"آخر تم چاہتے کیا ہو۔؟"

"ہیلو۔!" دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی...

ڈاکٹر اشفاق کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں... یہ آواز بالکل ان کی بیگم کی تھی...

انہوں نے خاموشی سے ریسیور رکھ دیا... ان کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے...

پھر انہوں نے ریسیور اٹھا کر تپائی پر رکھ دیا...

☆

کتے باہر بہت زور سے بھونک رہے تھے... ان کی آوازوں سے سب گھر والے جاگ گئے تھے... صرف یاسر سو رہا تھا...

اتنی شدت سے وہ پہلے کبھی نہیں بھونکے تھے... سب سہم گئے تھے...

"خدا خیر کرے... کہیں باہر کوئی چور نہ آگیا ہو۔" ڈاکٹر اشفاق کا لہجہ فکر مند تھا...

سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں....

"میں دیکھتا ہوں۔" ڈاکٹر اشفاق نے اٹھتے ہوئے کہا...

"نہیں آپ نہ جائیں..." بیگم اشفاق گھبرا گئیں۔

"تم فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہوتا... میں پستول ساتھ لے کر جا رہا ہوں..." ڈاکٹر اشفاق نے الماری سے پستول نکالتے ہوئے کہا...

ان کے پاس دو کتے تھے اچھی نسل کے... ان دونوں کو وہ رات کے وقت کھلا چھوڑ دیتے تھے... ایک بار پہلے بھی ان کتوں نے ایک چور بھگایا تھا...

پستول ہاتھ میں پکڑے ڈاکٹر اشفاق کمرے سے نکل گئے۔ بچے سہم کر لحافوں میں دبکے ہوئے تھے... کتوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں...

اچانک دونوں کتے بہت زور سے چیخے... اور پھر تو جیسے انہیں چیخوں کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"امی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" فاطمہ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی...

بیگم اشفاق کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ باہر سے ایک دردناک چیخ سنائی دی۔ یہ صرف ایک کتے کی چیخ تھی... یہ ایسی دردناک تھی کہ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے تھے۔

اتنے میں ڈاکٹر اشفاق واپس کمرے میں آئے... ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے...

"کیوں... کیا ہے یہ سب؟" بیگم اشفاق نے پوچھا۔

"بیگم میں باہر ہی نہیں گیا۔"

"کیوں...؟"

"میں نے باہر جانے والے ہر دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر کوئی کھل ہی نہیں رہا۔"

"کیا...!!"

"ہاں! سب دروازوں کی چٹخنیوں کو نہ جانے کیا ہوا ہے، کوئی کھلتی ہی نہیں ہے..."

"یا اللہ رحم!" بیگم اشفاق کے منہ سے اتنا نکلا تھا... بچے رونے لگے تھے...

بیگم اشفاق انہیں تسلیاں دینے لگیں...

"نہ جانے اس گھر میں کیا ہو رہا ہے... جب سے یہ درخت اُگا ہے عجیب ہی حالات ہو گئے ہیں..." ڈاکٹر اشفاق بہت سنجیدہ تھے۔

اب باہر خاموشی چھا چکی تھی...

اندر بھی سب خاموش ہو گئے تھے...

اس خاموشی میں اچانک ایک آواز آنے لگی... یہ آواز ٹیلی ویژن کی تھی...

"یہ ٹیلی ویژن کس نے آن کر دیا..." ڈاکٹر اشفاق کے لہجے میں حیرت تھی...

کوئی کیا جواب دیتا۔ سب کے سب تو اسی کمرے میں موجود تھے...

"سب تو یہاں ہیں پھر یہ خود بخود کیسے آن ہو سکتا ہے؟"

سب ٹی وی والے کمرے میں آئے... وہ چل رہا تھا...

ڈاکٹر اشفاق نے آگے بڑھ کر اس کا بٹن آف کر دیا... پھر سب طرف خاموشی چھا گئی...

اس خاموشی میں ایک اور مدھم سی آواز انہیں آ رہی تھی... انہوں نے غور کیا۔

یہ ان کے ایک کتے کے غرانے کی آواز تھی... وہ پھر واپس آ گئے تھے اپنے کمرے میں... اور سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔

اتنے میں آمنہ اپنے بستر سے اٹھی اور فریج کی طرف بڑھی... اس کے ہینڈل کو پکڑ کر کھینچا... مگر فریج نہ کھُلا۔

"ابو! یہ فریج نہیں کھل رہا... مجھے سخت پیاس لگی ہے۔" آمنہ نے کہا...

"ایک تو تم میں طاقت ہی اتنی ہے..." ڈاکٹر اشفاق بولے۔ "فاطمہ تم اٹھ کر کھول دو۔"

فاطمہ نے بھی آ کر زور لگایا مگر وہ نہ کھلا...

"ابو یہ تو مجھ سے بھی نہیں کھل رہا..." فاطمہ کی آواز میں خوف تھا...

"اچھا؟" ڈاکٹر اشفاق نے حیرت سے کہا...

پھر وہ خود آئے اور فریج کے دروازے کو پکڑ کر زور سے کھینچا... مگر وہ نہ کھلا... ان

سب نے فریج کھولنے کی پوری کوشش کر لی... مگر سب بے سود...

"مجھے لگتا ہے کہ اس گھر پہ کوئی آسیب آگیا ہے۔" فاطمہ بہت ڈر گئی تھی۔

"کوئی آسیب نہیں ہے... سارا دن تو آسیبوں پر کہانیاں پڑھتی رہتی ہو۔ اب آسیب ہی نظر آئیں گے۔" ڈاکٹر اشفاق بولے...

"مگر پھر فریج کیوں نہیں کھل رہا۔۔؟" بیگم اشفاق نے حیرانی سے پوچھا...

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید یہ خراب ہو گیا ہو... آخر مشین کا کیا اعتبار.." ڈاکٹر اشفاق نے جواب دیا۔

٭

بیگم اشفاق کی آنکھ کسی آواز سے کھلی تھی... چاروں طرف اندھیرا تھا... "شاید بجلی چلی گئی ہے"... انہوں نے سوچا... مگر یہ آواز...

"ٹک ٹک ٹک ٹک..."

"یہ کیسی آواز ہے۔؟" وہ حیران تھیں، اتنے میں کسی نے ٹارچ جلا دی۔

"کیا یہ آپ ہیں۔؟" بیگم اشفاق نے پوچھا...

"ہاں بیگم! یہ آواز کیسی ہے۔؟" ڈاکٹر اشفاق نے ٹارچ اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے کہا...

"پتا نہیں میں تو خود حیران ہوں۔"

اچانک ٹارچ کی روشنی کا دائرہ فرش پہ ایک جگہ رُک گیا... وہاں بیٹری سے چلنے والی ایک گڑیا تھی... جو کہ ٹک ٹک کی آواز سے چلی آ رہی تھی...

"یہ یہاں کہاں آ گئی ہے۔؟" بیگم اشفاق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا اس وقت کوئی اس سے کھیل رہا ہے؟" ڈاکٹر اشفاق بھی حیران تھے...

"ابو... یہ تو میری ہے۔" اندھیرے میں سارہ کی ڈری ڈری آواز آئی... وہ بھی جاگ گئی تھی...

"تم نے کیا اس کا بٹن آن رہنے دیا تھا۔؟"

"نہیں ابو میں نے تو اس سے کھیلا ہی نہیں آج۔"

ڈاکٹر اشفاق نے جو ٹارچ روشن کر رکھی تھی اس کا دائرہ ابھی تک اس گڑیا پر مرکوز تھا... گڑیا اب رُک چکی تھی۔ مگر اِسی وقت "ٹک ٹک" کی آواز پھر آنے لگی اور پھر تو ان سب کی حیرت دیکھنے والی تھی... بیٹری سے چلنے والا ایک بھالو چلا آ رہا تھا...

"اف خدایا!" بیگم اشفاق کی آواز میں دہشت تھی...

یہ کھلونے ساتھ والے کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے تھے... اس کمرے میں بچوں کے کھلونے رکھے ہوئے تھے...

"ابو... کہیں اس کمرے میں کوئی ہو نہ۔؟" فاطمہ نے کہا... وہ بھی جاگ گئی تھی...

سب خاموش تھے... اس خاموشی میں ایک آواز آنے لگی۔

"زم... زم... زم۔"

اب ایک پولیس گاڑی تھی جو چلی آ رہی تھی...

ڈاکٹر اشفاق بستر سے اٹھ گئے تھے...

"آپ کدھر چلے۔؟" بیگم اشفاق نے پوچھا۔

"جنریٹر آن کر دوں، تاکہ بجلی تو آئے پھر دیکھیں گے کہ یہ کھلونے کیوں چلے آ رہے ہیں..."

جنریٹر اس کمرے کے قریب ہی تھا... دو منٹ کے بعد ہی روشنی ہو گئی تھی...

سب ڈرتے ڈرتے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے... اگلا منظر ان کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا... سارے کمرے میں بیٹری سے چلنے والے کھلونے چل رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک کونے میں رکھا ہوا ہاتھی خود بخود "سٹارٹ ہوا تھا... اور کمرے میں چلنے لگا تھا...

ڈاکٹر اشفاق نے ایک کھلونے کو اٹھا کر اس کا سوئچ آف کیا اور اسے دوبارہ اس کی جگہ رکھ دیا... مگر رکھنے کے فوراً بعد وہ پھر آف ہو گیا تھا...

"یا اللہ رحم۔!" بیگم اشفاق کے منہ سے نکلا...

"امی۔!" آمنہ اور فاطمہ اپنی امی سے چمٹ گئی تھیں...

"مجھے لگتا ہے اس گھر میں آسیب آگیا ہے۔۔۔ پہلے میں ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتی تھی، مگر اب یقین آگیا ہے۔" بیگم اشفاق نے کہا۔

ڈاکٹر اشفاق خاموش کھڑے تھے۔۔۔ ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔۔۔

پھر اچانک ہی سب کھلونے رک گئے۔۔ ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔۔۔ اس خاموشی میں انہیں کتے کی غراہٹ سنائی دے رہی تھی ۔۔۔

وہ سب خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں آگئے۔۔۔ یاسر اپنے بستر پر خاموشی سے سو رہا تھا۔۔۔

ڈاکٹر اشفاق ساری رات نہ سو سکے۔۔۔ البتہ باقی سب جلد ہی گہری نیند میں چلے گئے تھے۔۔۔

صبح فجر کے وقت ڈاکٹر اشفاق نے سب کو جگایا۔ پھر انہوں نے نماز ادا کی۔۔۔ نماز کے بعد وہ باہر روشنی پھیلنے کا انتظار کرتے رہے۔۔۔

روشنی پھیلنے کے بعد ڈاکٹر اشفاق باہر کے دروازے کی طرف بڑھے۔۔ اس بار چٹخنی آسانی سے کھل گئی تھی۔۔۔

"کمال ہے۔!"

ڈاکٹر اشفاق حیران تھے۔ انہوں نے چٹخنی دوبارہ لگا کر پھر کھولی۔۔۔ کچھ مشکل نہ ہوئی۔۔۔

وہ اس پر حیران ہوتے ہوئے باہر آگئے۔۔۔ برآمدے سے آگے لان تھا۔۔۔

ابھی انہوں نے برآمدے سے لان میں اترنے والی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ ان کی نظر لان کے ایک کونے پر پڑی۔۔۔

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔۔۔

اور ہو سکتا تھا کہ وہ کئی منٹ اِسی طرح سکتے میں رہتے۔۔۔ کہ اچانک کتے نے ان پر چھلانگ لگائی۔۔ وہ جلدی سے گھر کے دروازے کی طرف بھاگے۔۔۔ اتنی تیزی انہوں نے ساری زندگی نہیں دکھائی تھی۔۔۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے دروازے میں داخل ہوئے اور چٹخنی لگالی۔۔۔

کتا باہر دروازے کے پاس کھڑا غرّا رہا تھا۔۔۔ بھاگنے کی آوازیں سن کر دوسرے گھر والے بھی آ گئے تھے۔۔۔

انہوں نے جوں ہی کتے کو دیکھا۔۔۔ ان کی چیخیں نکل گئیں۔

دروازے کی جالی کے پیچھے سے کتا انہیں گھور رہا تھا۔۔۔ اس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔۔۔ اور دانتوں سے خون ٹپک رہا تھا۔۔۔

"یہ۔۔۔ یہ اسے کیا ہوا ہے۔۔۔؟" بیگم اشفاق کی آواز لرز رہی تھی۔۔۔

"بیگم خدا جانے کیا ہوا ہے۔۔۔ میں جب باہر نکلا۔۔۔ تو یہ دوسرے کتے کا گوشت کھا رہا تھا۔۔۔" ڈاکٹر اشفاق کا لہجہ سنجیدہ تھا۔۔۔

"کیا۔!!" سب چیخ اٹھے۔۔۔

"امّی!" آمنہ رونے لگ گئی تھی۔۔۔

"کتا پاگل ہو چکا ہے۔۔۔ اسے ختم کرنا بہت ضروری ہے۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔۔۔ کمرے سے پستول لے کر وہ پھر دروازے تک آئے۔۔۔ ایک ہاتھ میں انہوں نے پستول تھاما اور دوسرا ہاتھ چٹخنی کی طرف بڑھایا۔۔۔ مگر کتا جالی کے بالکل قریب آگیا تھا۔۔۔

"دروازہ نہ کھولیے گا۔۔۔ یہ حملہ کر دے گا۔۔" بیگم اشفاق چلائی تھیں۔۔۔

واقعی دروازہ کھولنا بہت خطرناک تھا۔۔۔

اچانک ان کے ذہن میں ایک خیال آیا۔۔۔

کسی اور دروازے سے نکل کر گولی چلائی جائے۔۔" چنانچہ وہ مڑے اور ایک اور کمرے سے نکلنے والے دروازے کی طرف بڑھے۔۔۔ مگر وہ جوں ہی اس دروازے کے پاس پہنچے، کتا وہاں پہلے ہی موجود تھا۔۔۔ اور سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔۔۔ اس نے اپنی زبان باہر نکالی ہوئی تھی جو کہ خون سے سرخ ہو رہی تھی۔۔۔

ڈاکٹر اشفاق حیران تھے کہ اِسے کیسے پتا چل گیا کہ میں اس دروازے پر آگیا ہوں۔ شاید یہ خوشبو سونگھ کر آیا ہے۔؟

اور پھر انہوں نے جس دروازے سے بھی باہر جانا چاہا.. کتا پہلے موجود تھا...
اب تو وہ پنجوں سے دروازے کی جالی توڑنے کی بھی کوشش کر رہا تھا...
یہ بہت خطرناک بات تھی... جلد ہی کچھ کرنا چاہیے تھا...
ان کے ذہن میں ایک اور تجویز آئی ـــ انہوں نے الماری سے ایک بندوق نکالی... یہ دور مار بندوق تھی... اور خاصی طاقت رکھتی تھی...
پھر انہوں نے باہر کے ایک دروازے کے ساتھ والی کھڑکیوں کے سامنے ایک میز رکھی ...اور خود میز پر چڑھ گئے...
کھڑکیوں کے اوپر روشن دان تھے جو کہ زمین سے ۸، ۹ فٹ اونچے تھے...
انہوں نے ایک روشن دان تھوڑا سا کھولا اور اس میں سے باہر جھانکا...
مگر کتا انہیں کہیں نظر نہ آیا....
"کہاں گیا وہ... ؟" وہ سوچ رہے تھے...
"خیال رکھیے گا کہیں کتا یہاں سے نہ حملہ آور ہو جائے۔" بیگم اشفاق پریشان کھڑی تھیں...
وہ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے... اچانک ان کی نظر باغ کے کونے میں پڑی... کتا اپنے ساتھی کتے کی لاش کھانے میں مصروف تھا...
انہوں نے جلدی سے بندوق کو سیدھا کیا... اور نشانہ لے کر فائر کر دیا...
کتا زور سے اچھلا... اور زمین پر آ رہا... انہوں نے ایک اور فائر کیا... کتا اچھل کر اپنی جگہ سے پرے جا گرا تھا...
وہ کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ کتا بالکل ساکت پڑا تھا...
ڈاکٹر اشفاق میز سے نیچے اتر آئے...
"بیگم...! کتا مر گیا ہے..."
بیگم نے کوئی جواب نہ دیا...
پھر وہ سب باغ کی طرف چلے...
باغ کے اس کونے کا منظر بہت خوفناک تھا...

ایک کتے کی لاش آدھی سے زیادہ کھائی جا چکی تھی... دوسرا کتا اس سے کچھ فاصلے پر خون میں لتھڑا پڑا تھا...
"یہ بھی سیاہ درخت کی وجہ سے ہوا ہے..." ڈاکٹر اشفاق نے کہا...
"ہمیں کتوں کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا... لگتا ہے کہ رات کو یہ کتے اس سیاہ درخت کا شکار ہو گئے... اور پاگل ہو گئے... پھر ان میں سے ایک نے دوسرے کو مار کھایا۔" ڈاکٹر اشفاق کو کتوں کی چیخیں یاد آ رہی تھیں جو رات انہوں نے سنی تھیں۔
آمنہ اور فاطمہ رو رہی تھیں... انہیں کتوں سے بہت پیار تھا...
اگر آج مسجد سے ذرا برابر بھی دیر ہو جاتی تو میں بھی کتے کا شکار ہو چکا ہوتا..." ڈاکٹر اشفاق نے جھرجھری لی...
"اللہ نہ کرے..." بے اختیار بیگم اشفاق کے منہ سے نکلا...
اللہ جانے یہ درخت کیا ہے...؟" ڈاکٹر اشفاق اب درخت کی جانب دیکھ رہے تھے۔
سب نے دیکھا سورج کی پہلی کرنوں میں وہ چمکتا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا...
"جتنی جلد ہو اسے یہاں سے نکلوائیں ورنہ... ورنہ..."
بیگم اشفاق اتنا کہہ کر رک گئی تھیں، ان کی آواز بھرا گئی تھی...
"میں آج ڈاکٹر نیازی کو فون کرتا ہوں... آج ہر حال میں اسے یہاں سے نکلوا دوں گا انشاءاللہ ـــ اور اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو آج ہم اس گھر سے چلے جائیں گے... اور واپس تب آئیں گے جب اس درخت کا مسئلہ حل ہو چکا ہو گا..."
اسی وقت فاطمہ اور آمنہ ایک ساتھ چیخی تھیں...
"ابو...!!"
ڈاکٹر اشفاق سیاہ درخت کی طرف دیکھ رہے تھے... فاطمہ اور آمنہ ان کے پیچھے کھڑی تھیں....
وہ فوراً پیچھے مڑے... وہاں کا منظر بہت دہشت ناک تھا...

یاسر ہاتھ میں ایک بڑا چاقو لیے کھڑا تھا۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ تھی۔۔۔
ابھی سب حیرت سے اسے دیکھ ہی رہے تھے کہ اس نے ڈاکٹر اشفاق پر حملہ کر دیا۔۔۔
ڈاکٹر اشفاق پھرتی سے بچے۔۔۔ اور ساتھ ہی انہوں نے یاسر کا بازو پکڑ لیا۔
مگر اگلا لمحہ سب کے لیے حیرت انگیز تھا۔۔۔ یاسر نے ایک جھٹکا دیا تھا اور ڈاکٹر اشفاق اچھل کر دور جا گرے تھے۔۔۔
ایک آٹھ سال کے بچے میں اتنی طاقت۔ ناقابلِ یقین تھا یہ۔۔۔
امی رونے لگی تھیں۔۔۔
یاسر میرے بیٹے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ اس کی طرف بڑھیں۔
مگر یاسر نے انہیں بھی ایک دھکا دیا تو وہ اچھل کر دور جا گریں۔۔۔
یاسر بھی ڈاکٹر اشفاق کی طرف بڑھا۔۔۔ وہ گھاس پر گرے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔۔۔
یاسر نے چاقو اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے کہ وہ ان پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔۔۔
یاسر جوں ہی قریب آیا۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق نے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر کھینچ لیا۔۔۔
یاسر گر گیا اور اس کے ہاتھ سے چاقو نکل گیا تھا۔ فاطمہ نے فوراً آگے بڑھ کر چاقو اٹھا لیا۔
"بیگم جلدی سے نیند کا انجکشن لے کر آؤ، ساتھ سرنج بھی، جلدی کرو۔۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے یاسر کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔
بیگم اشفاق گھر کی طرف بھاگیں۔۔۔ فاطمہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔۔۔
یاسر قابو میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔۔۔ اور منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔۔۔
بیگم اشفاق اور فاطمہ بھاگتی ہوئی گھر سے نکلی تھیں۔ فاطمہ آگے تھی اس کے ہاتھ میں سرنج اور انجکشن والی شیشی تھی۔۔۔
"فاطمہ سرنج میں دوائی بھر کر مجھے دو۔۔۔" ڈاکٹر اشفاق چلائے۔۔۔
ان کے چہرے پر سے پسینے کے قطرے تھے۔۔۔ صاف لگتا تھا کہ یاسر کو قابو میں

رکھنے کے لیے انہیں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔۔۔
فاطمہ نے کانپتے ہاتھوں سے سرنج میں دوائی بھری اور اپنے ابو کی طرف بڑھائی۔۔۔
ڈاکٹر اشفاق نے ایک ہاتھ سے یاسر کی ٹانگیں پکڑیں اور دوسرا ہاتھ سرنج کی طرف بڑھایا۔۔
مگر اسی وقت یاسر ان کی گرفت سے نکل گیا۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق نے سرنج پکڑی اور اس کے پیچھے بھاگے۔۔۔ یاسر کا رخ سیاہ درخت کی طرف تھا۔۔۔ یہ دیکھ کر سب گھبرا گئے تھے۔
"خدا کے لیے اس کو پکڑ لیں۔" بیگم اشفاق رو رہی تھیں۔۔۔
ڈاکٹر اشفاق نے چھلانگ لگائی اور یاسر کے اوپر گرے۔۔۔
اور پھر جلدی سے انہوں نے اس کی ران میں ٹیکا لگا دیا۔۔۔ ٹیکا لگنے کے چند ہی لمحوں میں یاسر کی حرکت سست پڑ گئی۔۔۔ اور پھر وہ گہری نیند میں چلا گیا تھا۔۔۔
ڈاکٹر اشفاق اس کے اوپر سے اٹھے۔۔۔ انہوں نے دیکھا سیاہ درخت صرف چار فٹ کے فاصلے پر تھا۔۔۔

☆

ڈاکٹر اشفاق ہسپتال چلے گئے تھے۔۔۔ بیگم اشفاق نے فون کر کے بجلی کی شکایت لکھوا دی تھی۔۔۔ کچھ ہی دیر میں بجلی والوں کا آدمی آ گیا تھا۔۔۔
اس نے سب سے پہلے تو بجلی کے کھمبے پر چڑھ کر لائن کو چیک کیا۔۔۔
"بیگم صاحبہ! لائن میں تو کوئی خرابی نہیں ہے، میٹر دیکھنا ہو گا۔" لائن مین نے گھر میں آتے ہوئے کہا۔۔۔
بیگم اشفاق دروازے کے پیچھے سے ہی گفتگو کر رہی تھیں۔
"ٹھیک ہے تم میٹر دیکھ لو۔۔۔"
لائن مین نے میٹر کھولا اور اپنے ٹیسٹر سے مختلف جگہ ٹیسٹ کرنے لگا۔۔۔
مگر جوں ہی اس نے ٹیسٹر ایک جگہ لگایا۔۔۔ اس کی زوردار چیخ نکل گئی۔۔۔
"آ۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ آہ۔۔۔"
اس کا جسم بھی کانپ رہا تھا۔۔۔

بیگم اشفاق نے بھی ایک چیخ ماری تھی...

لائن مین کا جسم جھٹکے پر جھٹکے کھا رہا... اور پھر کچھ دیر بعد وہ فرش پر آ رہا... اس کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا...

بیگم اشفاق جلدی جلدی سے فون کی طرف بھاگیں...

"ہیلو... ! آپ جلدی پہنچیں... !" انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا...

ڈاکٹر اشفاق چند ہی منٹوں میں آ گئے تھے... وہ حیرت سے بیگم کی زبانی سب سُن رہے تھے...

"نہ جانے اس گھر میں کیا ہو رہا ہے... یہ سیاہ درخت آخر کیا بلا ہے جو ہمارے گھر میں آ گیا ہے..." اچانک ان کی نظر اس درخت کی اوپری شاخوں پر پڑی...

درخت کے اوپر سے بجلی اور ٹیلی فون کی تاریں ساتھ ساتھ گزر رہی تھیں ــ اور ان دونوں تاروں سے درخت کی کچھ شاخیں لپٹی ہوئی تھیں...

اچانک ان کے ذہن میں ایک خیال آیا... اور ان کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نمودار ہو گئے...

"کہیں... کہیں..." وہ سوچ رہے تھے...

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا...؟" بیگم اشفاق نے پوچھا۔

"بیگم لائن مین یہی کہہ رہا تھا کہ کھمبے سے لائن بالکل ٹھیک ہے...؟"

"جی ہاں! تبھی تو وہ میٹر دیکھنے آیا تھا۔"

"یوں کرو کہ پولیس کو فون کر دو... تاکہ لائن مین کا معاملہ دیکھیں وہ آ کر..."

☆

دوپہر تک وہ پولیس سے فارغ ہوئے تھے...

پھر انہوں نے ڈاکٹر نیازی کو فون کیا...

"ہیلو ــ! ڈاکٹر نیازی کا گھر ہے یہ ــ جی انہیں سے بات کرنی ہے... لیبارٹری گئے ہوئے ہیں... وہاں کا نمبر... جی شکریہ۔" انہوں نے نمبر نوٹ کرتے ہوئے کہا...

کریڈل دبا کر انہوں نے دوسرے نمبر ڈائل کیے...

"جی... ڈاکٹر نیازی؟... السلام علیکم! میں ڈاکٹر اشفاق بول رہا ہوں... آپ سنائیں کیسے ہیں... بھئی میں نے اس درخت کے سلسلے میں فون کیا ہے... آپ کے تجزیے کا کیا بنا... اچھا ــ!"

وہ کچھ دیر خاموشی سے سنتے رہے... تو کیا میں لیبارٹری آ جاؤں ــ؟... ٹھیک ہے میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں..."

انہوں نے ریسیور رکھ دیا...

"بیگم میں ڈاکٹر نیازی کی طرف جا رہا ہوں... وہ کہتے ہیں کہ درخت پر تجزیہ مکمل ہو گیا ہے... اور بہت عجیب رپورٹ آئی ہے..."

"اللہ خیر کرے... آپ ان سے درخت کو کٹوانے کی ضرور بات کیجیے گا..."

"ظاہر ہے... سب سے اہم بات یہی ہے... اور ہاں کوئی عجیب و غریب فون آئے تو خاموشی سے ریسیور رکھ دینا۔" ڈاکٹر اشفاق نے کار کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا...

"کیا مطلب ــ؟ عجیب و غریب فون کیا؟" بیگم کے لہجے میں حیرت تھی...

"مطلب میں بعد میں بتاؤں گا..."

ڈاکٹر اشفاق کمرے سے نکل گئے...

بیگم حیران کھڑی ٹیلی فون کو دیکھ رہی تھیں...

☆

ڈاکٹر نیازی کے دفتر کا کمرہ بہت شاندار تھا... زمین پر قالین... خوب صورت صوفے... خوشنما پردے...

"آئیے ڈاکٹر صاحب! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" ڈاکٹر نیازی نے ڈاکٹر اشفاق کا استقبال کرتے ہوئے کہا...

"آپ کی بات سن کر میں فوراً ہی چلا آیا..." ڈاکٹر اشفاق نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا...

"میں خود بھی آپ کی طرف آ سکتا تھا مگر تجزیے کی مزید رپورٹ ابھی ایک گھنٹے میں

موصول ہونے والی ہے ... میں نے سوچا آپ کو یہیں بلالوں .. تاکہ پہلی رپورٹ پر بات کر سکیں ... اور اسی دوران میں مفصّل رپورٹ بھی آجائے گی .." ڈاکٹر نیازی نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا ...

اچھا کیا۔ اب یہ بتائیں کہ درخت کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہوا ہے .."

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پوری دنیا میں اس جیسا کوئی اور درخت نہیں ہے .."

"اچھا۔ ؟"

"جی ہاں .. دنیا کی کسی کتاب میں اس جیسے درخت کا ذکر نہیں ہے ... میں نے بہت تحقیق کی ہے .."

"تو پھر یہ یہاں کیسے اُگ آیا۔ ؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا۔

"اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ... یہ ایک الگ مسئلہ ہے .." ڈاکٹر نیازی کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے ...

"آپ درخت کے بارے میں بتا رہے تھے .." ڈاکٹر اشفاق نے ڈاکٹر نیازی کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"ہاں !" وہ چونک گئے ...

اور پھر کہنا شروع کیا ...

"آپ یہ تو جانتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی جاندار ہیں وہ آکسیجن میں زندہ رہتے ہیں سوائے چند ایک خوردبینی جراثیموں کے جو کہ کاربن ڈائی آکسائڈ میں زندہ رہتے ہیں ... مگر جب اس درخت پر تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ یہ نہ تو آکسیجن استعمال کر رہا ہے اور نہ کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) بلکہ یہ نائٹروجن گیس میں زندہ ہے .."

"کیا۔ !" ڈاکٹر اشفاق کی حیرت دیکھنے والی تھی۔

"جی ہاں ! یہ دنیا کا واحد درخت ہے جو کہ نائٹروجن گیس استعمال کر کے زندہ ہے ... اسے آکسیجن یا (O_2) کی ضرورت نہیں ہے ... اور آپ کو یہ بھی پتا ہے کہ ہماری اس ہوا میں نائٹروجن کا تناسب سب سے زیادہ ہے .."

"مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسے ختم کیسے کیا جاسکتا ہے ؟" ... ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا۔

"دیکھیں میں چاہتا ہوں کہ فی الحال اس درخت کو اسی طرح رہنے دیا جائے ... میں اس پر تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ میری اس تحقیق سے میری پوری دنیا میں شہرت ہوگی ... میں زراعت میں دنیا کو نئے نظریے دوں گا .." ڈاکٹر نیازی کے لہجے میں جوش تھا ...

"ڈاکٹر نیازی آپ کی بات ٹھیک ہے مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آج یہ درخت ایک اور موت کا ذمّہ دار بن چکا ہے .."

"اچھا۔ ؟"

"جی ہاں ! اور اسی کی وجہ سے ہمارے کتے بھی پاگل ہو چکے ہیں۔"

"اوہ۔ !" ڈاکٹر نیازی کے لہجے میں حیرت تھی ... ڈاکٹر اشفاق نے انہیں لائن مین، کتوں اور یاسر کے بارے میں تفصیل سے بتایا ...

"اُف یہ تو بہت خطرناک ہے .."

"جی ہاں ! میں اسی لیے چاہتا ہوں کہ اسے جلد سے جلد نکلوا دیا جائے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ کوئی تجویز سوچیں۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔

"آپ کا کیا خیال ہے ... کہ یہ درخت سوچ رکھتا ہے ؟" ڈاکٹر نیازی نے پوچھا۔

اس پر ڈاکٹر اشفاق نے شاخ کا درخت کاٹنے والے پر حملہ اور فاطمہ کی بتائی ہوئی تفصیل سنا دی ...

"واقعی ... میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ درخت کچھ سوچ رکھتا ہے ... اور یہ اور خطرناک بات ہے .."

"میرا ایک اور بھی خیال ہے ... جو ہو سکتا ہے، غلط بھی ہو ... مگر زیادہ امکان اس کے درست ہونے کا ہے .." ڈاکٹر اشفاق نے خیال ظاہر کیا ...

"وہ کیا۔ ؟"

"ہمارے گھر کی ٹیلی فون اور بجلی کی لائنیں اس درخت کے اوپر سے گزرتی ہیں ... اور درخت کی کئی شاخیں ان لائنوں سے لپٹی ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ درخت کسی طرح

ان لائنوں میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔۔ اسی درخت نے ہمارے گھر کی بجلی بند کر رکھی ہے ۔۔۔ اور ٹیلی فون پر بھی قبضہ جما لیا ہے۔۔۔ رات کو گھنٹیاں بجتی ہیں۔۔ میں جب فون اٹھاتا ہوں تو دوسری طرف سے مجھے اپنی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔۔۔ گھر کا فریج نہیں کھلتا۔۔ کھلونے خود بخود چلنے لگتے ہیں۔۔۔ باہر کے دروازے کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔۔ جب کہ باہر کوئی نہیں ہوتا۔۔۔ یہ ضرور یہ درخت ہی کر رہا ہے۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ یہ باتیں انہونی ہیں۔۔ اور کوئی ان پر یقین نہیں کرے گا۔۔۔ مگر جن حالات سے ہم گزرے ہیں ان کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے۔۔۔"
ڈاکٹر اشفاق یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

ڈاکٹر نیازی حیرت سے یہ سب سن رہے تھے۔۔ "اگرچہ آپ کے خیالات ناقابلِ یقین ہیں مگر پھر بھی میں انہیں کسی حد تک صحیح سمجھتا ہوں۔۔" ڈاکٹر نیازی نے کہا۔۔

"اچھا آپ بتا رہے تھے کہ اس کیاری میں آپ نے گیندے کے بیج اگائے تھے؟"

"جی ہاں یہ سچ ہے مگر ان میں سے کوئی پودا بھی نہیں ہوا۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے بتایا۔۔۔

"تحقیق سے پتا چلا ہے کہ اس درخت کے پتے میں کچھ خوبیاں ایسی ہیں جو کہ گیندے کے پودوں کے پتوں میں پائی جاتی ہیں۔"

"اچھا۔!" ڈاکٹر اشفاق حیران ہوئے۔

"جی ہاں! یوں لگتا ہے کہ یہ درخت گیندے کی کوئی بدلی ہوئی شکل ہے۔۔۔ آپ یہ بتائیں کہ کہیں اس کیاری کو کوئی عجیب و غریب کھاد تو نہیں دی گئی۔۔۔؟" ڈاکٹر نیازی نے پوچھا۔۔۔

"عجیب و غریب کھاد۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔۔۔ مالی ہی کھاد دیا کرتا تھا۔۔۔ وہ اب دنیا میں نہیں رہا۔۔"

"یا پھر آپ میں سے کسی نے کوئی عجیب دوائی یا کوئی اور چیز اس جگہ تو نہیں دبائی۔۔۔؟"

"نہیں میرے خیال میں تو نہیں۔۔۔ مگر بیگم سے پوچھنا پڑے گا۔۔۔ ویسے آپ کیا سوچ رہے ہیں۔؟"

"میرا خیال ہے کہ کسی کھاد سے یا اسی قسم کی کسی اور چیز سے گیندے کے بیج میں کوئی تبدیلی آ گئی اور وہ اس قسم کے درخت میں تبدیل ہو گیا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ بیج میں ہی ساری معلومات ہوتی ہیں کہ کس قسم کا درخت بنانا ہے۔۔۔" ڈاکٹر نیازی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"پچھلے سال کے دوران مجھے نہیں یاد پڑتا۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔۔۔ جیسے وہ ذہن پر زور دے رہے ہوں۔۔۔

پھر اچانک ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔۔۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور دہشت کا عجیب امتزاج تھا۔۔۔ وہ ڈاکٹر کی طرف پلکیں جھپکائے بغیر دیکھے جا رہے تھے۔۔۔

"یہ آپ مجھے کیوں ایسے دیکھ رہے ہیں۔؟" ڈاکٹر نیازی بھی حیران تھے۔

☆

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی۔۔۔ بیگم اشفاق کسی کمرے میں جاتے ہوئے ٹیلی فون کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ انہوں نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔!"

"ہیلو۔" دوسری طرف سے ایک عجیب سی بھاری آواز آئی۔

"جی۔؟"

"آپ کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔۔" دوسری طرف سے اسی آواز میں کہا گیا۔۔

"نہیں۔!!" بیگم اشفاق چلائی تھیں۔۔۔ ریسیور ان کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔۔۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر پھرنے لگ گئی تھیں۔۔۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

اسی وقت انہیں خیال آیا کہ ان کے شوہر جانے سے پہلے کہہ گئے تھے کہ کسی عجیب و غریب فون پر توجہ نہ دینا۔

اس سے انہیں کچھ تسلی ہوئی۔۔۔ پھر انہوں نے ریسیور اٹھایا۔۔۔ اور ہسپتال کے نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

"ہیلو۔! رشید۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق صاحب ڈاکٹر نیازی کی طرف گئے ہیں۔۔ تم ذرا پتا کرو۔۔۔ ایک فون آیا ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرّا

گئی تھی . . .

رشید ان کا بہت پرانا نوکر تھا . . . یہ سن کر اس کے بھی ہوش اڑ گئے . . .

⁂

"ہاں ! مجھے یاد آ گیا . . ." ڈاکٹر اشفاق کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی . . .
"کیا یاد آ گیا — ؟"

"اس جگہ جہاں درخت اگا ہے وہاں میں نے کچھ دوائیاں دبائی تھیں ۔"
"اچھا — ! کونسی دوائیاں . . ." ڈاکٹر نیازی حیران تھے . . .
"آپ جانتے ہیں کہ ہم ڈاکٹروں کو دوائیاں بنانے والی کمپنیاں مفت نمونے کی دوائیاں بھی دیتی ہیں . . ."
"جی ہاں !"

"ان میں سے بہت سی دوائیاں یوں ہی پڑی رہ جاتی ہیں اور استعمال نہیں ہوتیں . . . آج سے کوئی چار پانچ ماہ پہلے میں نے ایسی دوائیوں کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ بہت سی دوائیوں کی استعمال کرنے کی مدت پوری ہو چکی ہے اور اب یہ بے کار ہیں . . . میں نے ایسی تمام دوائیاں علیحدہ کیں اور انہیں اکٹھا باغ میں اس کیاری میں جگہ کھود کر دبا دیا ۔"
"مگر دبایا کیوں . . . آپ پھینک بھی تو سکتے تھے ۔ ؟" ڈاکٹر نیازی نے پوچھا . . .
"ایک بار پہلے میں نے ایسا ہی کیا تھا . . . کچھ لوگوں نے کوڑے میں سے دوائیاں اٹھا کر میڈیکل سٹور پر بیچ دیں ۔ آپ خود سوچیں کہ جن دوائیوں کی میعاد پوری ہو چکی ہو وہ کسی بیماری میں کیا کام دکھا سکیں گی ۔" ڈاکٹر اشفاق نے بتایا ۔
"تو اس کا مطلب ہے کہ میرا خیال ٹھیک ہے کہ یہ درخت گیندے کے بیج میں کسی تبدیلی کی وجہ سے اگا ہے . . . آپ کی دبائی ہوئی دوائیوں میں سے کسی ایک یا سب دوائیوں نے مل کر اس بیج پر اثر کیا ہو گا . . ."
"مگر کیا ایسا ممکن ہے ؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا ۔
"سائنسدان بیجوں پر ریڈیائی اثرات کر کے خود بھی نئے نئے پودے اگاتے رہتے ہیں — مگر اس قسم کا درخت تو پہلے دنیا میں کبھی بھی نہیں اگا تھا . . ."
اسی وقت دفتر کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور ایک شخص بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا . . . دونوں گھبرا گئے . . .
"کون ہو تم ؟" ڈاکٹر نیازی نے گرجدار آواز میں پوچھا ۔
ڈاکٹر اشفاق نے اسے پہچان لیا تھا . . . وہ رشید تھا ان کا نوکر . . .
"رشید — ! تم یہاں — ؟ کیا بات ہے — ؟ اور یہ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں — ؟" ڈاکٹر اشفاق بھی گھبرا گئے تھے . . .
"وہ . . . وہ . . . کیا آپ انتقال کر گئے ہیں ۔ ؟"
"کیا مطلب ۔ ؟ کیا میں تمہیں مرا ہوا نظر آ رہا ہوں ۔ ؟" ڈاکٹر اشفاق حیران تھے . . .
"وہ . . . بیگم صاحبہ کو فون آیا تھا کسی کا کہ آپ انتقال کر گئے ہیں ۔"
ڈاکٹر اشفاق نے ڈاکٹر نیازی کی طرف دیکھا . . .
"یہ یقیناً درخت کا کارنامہ ہے ۔"
ڈاکٹر نیازی نے کوئی جواب نہ دیا . . .
"رشید — تم فون بھی تو کر سکتے تھے . . . ؟"
"جی میں نے فون کیا تھا . . . مگر نمبر انگیج تھا . . . پھر ایکسچینج فون کیا ۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی ایکسچینج میں کوئی خرابی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے بہت سے ٹیلی فون کام نہیں کر رہے ہیں — اس لیے میں خود چلا آیا ۔"
"تم فوراً جاؤ — اور بیگم صاحبہ کو بتاؤ — اور ان سے کہنا کہ اب فون بالکل نہ اٹھائیں ۔"
"جی بہتر — !" رشید دفتر سے نکل گیا تھا . . .
"آپ نے دیکھا درخت کیا گیا گل کھلا رہا ہے . . ." ڈاکٹر اشفاق نے رشید کے جانے کے بعد ڈاکٹر نیازی سے کہا . . .
"واقعی اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا . . ."
اتنے میں ایک شخص چائے اور کچھ لوازمات لے کر کمرے میں داخل ہوا . . .

"لیجیے چائے پیجیے۔ اتنے میں مزید رپورٹ بھی آجائے گی۔۔۔ پھر درخت کو ختم کرنے پر غور کریں گے۔۔۔"

"یہ تو آپ نے تکلّف کیا۔۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ افضل کیا فون خراب ہوگیا ہے۔؟" دوسرا مخاطب چائے لانے والا تھا۔۔۔

"جی ہاں! ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تو فون ڈیڈ تھا۔"

کچھ دیر تک دونوں چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔۔ "میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے ۔۔۔ اگر ہم کوئی ایسا طریقہ کریں کہ جس سے درخت کو نائٹروجن ملنی بند ہو جائے تو کیا خیال ہے درخت مر نہیں جائے گا۔؟" چائے پینے کے دوران ڈاکٹر اشفاق نے تجویز پیش کی۔۔۔

"ہاں واقعی ایسا ممکن ہے۔۔۔ مگر یہ سوچنا پڑے گا کہ ایسا طریقہ کیا اختیار کیا جائے ۔۔۔ کیونکہ ہوا میں نائٹروجن بہت کثرت سے موجود ہے۔۔" ڈاکٹر نیازی نے کہا۔

"ہوا میں نائٹروجن کسی طرح ختم نہیں کی جاسکتی؟" صرف اس جگہ پر۔۔۔؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا۔

"نہیں ایسا ناممکن۔۔۔ ٹھہریں ایک خیال آیا ہے۔۔" ڈاکٹر نیازی کسی سوچ میں گم ہوگئے۔۔۔ اور پھر کچھ دیر بعد بولے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ اگر کہیں آگ لگ جائے تو کچھ خاص کے (FOAM) یا جھاگ وہاں سپرے کیے جاتے ہیں۔۔۔ یہ آگ والی جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور آگ تک آکسیجن نہیں پہنچنے دیتے۔۔۔ اور جب آکسیجن نہیں ہوتی تو آگ بھی بجھ جاتی ہے کیونکہ آکسیجن کی موجودگی میں ہی آگ اپنی زندگی برقرار رکھ سکتی ہے۔۔۔ اسی طرح کے جھاگ اگر ہم درخت پر پھینکیں جو کہ سارے درخت کو چھپالیں تو نائٹروجن درخت کو ملنی بند ہو جائے گی۔۔۔ مگر یہ دیکھنا ہوگا کہ کتنی دیر تک نائٹروجن کی سپلائی نہ ہو تو درخت مر جائے گا۔۔" ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا۔۔۔

اتنے میں ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔۔۔

"ہاں ڈاکٹر اطہر نعیم! کیا رپورٹ تیار ہے۔۔۔؟"

"جی ہاں سر! یہ رہی۔۔" ڈاکٹر اطہر نعیم نے کچھ کاغذات سامنے رکھ دیے۔۔۔

ڈاکٹر نیازی کاغذات کو غور سے پڑھتے رہے۔۔۔ دس منٹ کے بعد انہوں نے کاغذات سے سر اٹھایا۔۔۔

"ڈاکٹر اطہر! یہ بتاؤ کہ اگر اس درخت کو نائٹروجن کی سپلائی بند ہو جائے تو کتنی دیر میں یہ درخت مر جائے گا۔۔؟"

"سر دو یا تین منٹ میں۔!"

"اتنی جلدی۔؟" ڈاکٹر نیازی کے لہجے میں حیرت تھی۔۔۔

"جی ہاں سر! یہ درخت نائٹروجن کے سلسلے میں بہت حساس ہے۔۔"

"شکریہ ڈاکٹر اطہر!" ڈاکٹر نیازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

ڈاکٹر اطہر سلام کر کے کمرے سے چلا گیا۔۔۔

"لیجیے۔" صرف تین منٹ تک زندہ رہ سکتا ہے درخت۔"

"تو پھر کیا خیال ہے آپ کا۔۔۔ جھاگ والا طریقہ ٹھیک رہے گا۔؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا۔۔۔

"امید تو یہی ہے۔"

"جھاگ کا بندوبست کیسے ہوگا۔۔۔؟"

"میں کوشش کرتا ہوں۔۔۔ فائر بریگیڈ سے بات کرنی پڑے گی۔ امید ہے کل تک ہو جائے گا۔۔" ڈاکٹر نیازی نے بتایا۔

"کل تک۔! کیا آج ممکن نہیں۔؟"

"نہیں میں چاہتا ہوں کہ کچھ آدمی ہمارے شعبے کے بھی وہاں موجود ہوں ۔۔۔ اور کچھ اور حفاظتی انتظامات بھی ہوں۔"

"اچھا! اس رپورٹ میں کیا ہے۔؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا۔

"یہ رپورٹ بھی خاصی دلچسپ ہے۔۔۔ پتّے میں کچھ ایسے خلیے ملے ہیں جو کہ بہت سی

خصوصیات میں ان خلیوں سے ملتے ہیں جو کہ ہمارے دماغ میں ہوتے ہیں اور جن کی مدد سے ہمارا دماغ کام کرتا ہے۔۔"

"اوہ ۔۔!"

"اب تو مجھے یقین ہے کہ یہ درخت یقیناً سوچ رکھتا ہے۔۔۔ اور نہ جانے یہ سوچ کتنی خطرناک ہے ۔" ڈاکٹر نیازی نے جھرجھری لی۔۔۔

"مجھے تو اس سوچ کا۔۔۔ اس رپورٹ کے آنے سے پہلے ہی یقین تھا۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔۔۔

"اس سوچ کے مزید خطرناک ہونے سے پہلے اس کا ختم ہونا بہت ضروری ہے ۔"

☆

"آپ خیریت سے ہیں نا۔۔۔؟"

"ہاں بیگم! بالکل خیریت سے ہوں۔" ڈاکٹر اشفاق ڈاکٹر نیازی کے پاس سے آکر بیٹھے ہی تھے۔۔۔

"پتا نہیں کون سنگدل ہے جس نے فون کیا تھا۔۔ آپ انکوائری کروائیں۔۔۔" بیگم اشفاق نے کہا۔

"بیگم انکوائری کیا کروانی ہے۔۔۔ فون کرنے والا گھر ہی میں موجود ہے۔۔"

"کیا مطلب ۔؟" بیگم حیران تھیں۔۔۔

"یہ سیاہ درخت۔۔۔ یہی فون کر رہا ہے۔۔"

"سیاہ درخت ۔؟ مگر یہ کیسے فون کر رہا ہے۔۔"

"اس کی کچھ شاخیں بجلی اور ٹیلی فون کی تاروں پر لپٹی ہوئی ہیں، وہیں سے یہ سب گڑبڑ گڑبڑ کر رہا ہے۔۔"

"اُف خدایا ۔!" بیگم اشفاق کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔۔۔

"اس درخت کو ختم کروانے کے لیے کیا انتظام کیا ۔؟" انہوں نے کچھ دیر رک کر پوچھا۔۔۔

"ڈاکٹر نیازی نے ایک انتظام کرنے کا کہا تو ہے۔۔۔ مگر کل ہی کچھ ہو سکے گا۔"

"کل ۔۔؟"

"ہاں کل۔۔۔ ہمیں ایک رات اور گزارنی پڑے گی یہاں۔"

"نہیں ۔! میں بالکل نہیں رہوں گی۔۔۔" بیگم اشفاق گھبرا گئی تھیں۔۔۔ "جب تک یہ درخت ہے میں ایک دن بھی مزید یہاں نہیں رہ سکتی ۔"

"ایک رات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔"

"نہیں۔ نہیں۔ آپ یاسر کا بھی سوچیں نہ جانے اسے کیا ہے ۔"

آخر بیگم کے بے حد اصرار پر وہ اپنے ایک عزیز کے گھر رات گزارنے آگئے تھے۔۔۔ یہ قریب ہی رہتے تھے۔۔۔

یاسر دوبارہ جاگ گیا تھا۔۔۔ اور پہلے سے بھی عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔۔۔

بیگم اشفاق روئے جا رہی تھیں۔۔۔

"آپ اس کا بھی کچھ علاج کریں۔ آخر یہ ایسا کیوں ہو گیا ہے ۔؟"

"واقعی مجھے اس کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے تھا۔۔ سیاہ درخت نے تو کچھ اور سوچنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں ۔!" ڈاکٹر اشفاق کا لہجہ بھی فکرمند تھا۔۔۔

ڈاکٹر بشیر دماغ کے بہت ماہر ڈاکٹر مانے جاتے تھے۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق کے خاصے اچھے دوست تھے۔۔۔ انہوں نے ڈاکٹر بشیر کو ہی فون کیا تھا۔۔۔

"السلام علیکم! ڈاکٹر صاحب۔۔۔ میں ڈاکٹر اشفاق ہوں۔۔۔ آپ سنائیں کیسے ہیں۔۔۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔۔۔ اصل میں میرے بیٹے یاسر کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔۔۔ آپ کوئی وقت بتا دیں کب لے کر آجاؤں اسے ۔ اگر اس وقت لے آؤں تو۔۔۔ ٹھیک ہے بہت شکریہ۔۔۔ میں ابھی آرہا ہوں۔۔"

فون بند کر کے انہوں نے یاسر کو ساتھ لیا اور باہر کے دروازے کی طرف بڑھے۔۔۔

یاسر کچھ دور تو ساتھ چلا۔۔۔ مگر پھر رک گیا۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق نے اسے زبردستی کھینچا ۔ تو اس نے انہیں دھکا دے کر پرے ہٹا دیا۔۔۔

طاقت اس میں اب بھی اتنی ہی تھی۔۔۔

بیگم اشفاق بھی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔۔۔

"آپ اِسے انجیکشن لگاکر لے جائیں۔" انہوں نے مشورہ دیا۔"

"اب یہی کرنا ہوگا۔" ڈاکٹر اشفاق نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔۔۔

پھر ایک انجیکشن بھرا گیا۔۔۔ اسے لگانا بھی ایک مسئلہ تھا۔۔۔ کئی افراد نے یاسر کو پکڑا ۔۔۔ تب کہیں جاکر انجیکشن لگا۔۔۔

مگر اس بار انجیکشن سے یاسر کو نیند بالکل نہیں آئی تھی۔۔۔ چہرے پر وہی پُراسرار سی سنجیدگی تھی۔۔۔ آنکھوں میں اجنبیت کے آثار تھے۔۔۔

مگر یہ ہوا تھا کہ اس انجیکشن کے بعد اس کی طاقت کم ہوگئی تھی۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق نے جب اسے باہر لے جانا چاہا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔۔۔ اور خاموشی سے باہر چلا آیا تھا۔۔۔

ڈاکٹر بشیر کے ہسپتال پہنچنے میں انہیں کوئی پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔۔۔

ملازم نے انہیں ڈاکٹر بشیر کے کمرے تک پہنچا دیا تھا۔۔۔

٭

"آئیے ڈاکٹر اشفاق۔۔۔ یہ یاسر بیٹے کو کیا ہوا۔۔۔؟" ڈاکٹر بشیر نے استقبال کیا۔۔۔

یاسر بہت خونخوار آنکھوں سے ڈاکٹر بشیر کو گھور رہا تھا۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق نے تمام حالات سنا دیے جن سے وہ اور یاسر گزر رہے تھے مگر سیاہ درخت کا معاملہ وہ گول کر گئے تھے۔۔۔

ڈاکٹر بشیر بہت غور سے سُن رہے تھے۔۔۔

"ہوں!۔۔۔ بچوں میں ایسا ہو سکتا ہے اگر انہیں والدین بہت زیادہ دبا کر رکھیں۔۔۔ مگر میں کچھ ٹیسٹ کر لیتا ہوں۔۔۔"

ڈاکٹر بشیر نے بجلی کی کچھ تاروں کو یاسر کے سر کے مختلف حصّوں سے لگایا۔۔۔ یہ تاریں ایک مشین میں لگی ہوئی تھیں۔۔۔ مشین کو آن کرنے سے اس میں سے کاغذ کی پتلی مگر لمبی سلپ باہر نکلنے لگی۔۔۔ اس پر آڑی ترچھی لکیریں آ رہی تھیں۔۔۔ ڈاکٹر اشفاق اچھی طرح جانتے تھے کہ اِسے EEG کہتے ہیں اور اس سے دماغ کی لہروں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔۔۔ یہ بالکل ECG کی طرز پر ہوتی ہے جو کہ دل کے بارے میں معلومات دیتی ہے۔۔۔

ڈاکٹر بشیر بہت غور سے مشین سے نکلنے والے لمبے کاغذ کو پڑھ رہے تھے۔۔۔ آخر انہوں نے مشین روک دی۔۔۔

"کیا معلوم ہوا۔۔۔؟"

"کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔۔۔ میں نے کسی دماغ کی اتنی عجیب و غریب لہریں نہیں دیکھیں۔۔۔ بلکہ کسی ذہن کی ایسی لہریں ناممکن ہیں۔"

ڈاکٹر بشیر کے لہجے میں پریشانی تھی۔۔۔

"آپ کے خیال میں یہ سب کیا ہے۔۔۔؟"

"میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔ کچھ اور ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد شاید کچھ کہہ سکوں۔ ابھی ہم اس کے خون کا ٹیسٹ کر لیتے ہیں۔۔۔"

خون لینے کے لیے ڈاکٹر کا ایک اسسٹنٹ آیا تھا۔۔۔

آدھ گھنٹے میں رپورٹ آ گئی۔۔۔

"یہ رپورٹ اس سے بھی عجیب ہے۔۔۔" ڈاکٹر بشیر نے کہا۔

"اچھا۔۔۔؟"

"جی ہاں! آپ کے بیٹے کے خون میں کچھ عجیب سے خلیے گردش کر رہے ہیں۔۔۔ ان کی شکل ایسی ہے جیسے کہ ہمارے دماغ کے خلیے ہوتے ہیں۔۔۔ یہ خلیے کیا ہیں۔۔۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔۔۔ البتہ باقی رپورٹ ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر بشیر کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے۔۔۔

ڈاکٹر اشفاق نے بھی رپورٹ دیکھی۔۔۔ واقعی ایسا ہی تھا۔۔۔

ڈاکٹر بشیر عجیب نظروں سے یاسر کو دیکھ رہے تھے۔۔۔ اور یاسر سب سے بے نیاز EEG والی مشین کو دیکھ رہا تھا۔۔۔

"آپ یوں کریں کہ اسے کوئی سونے کا انجیکشن لگا دیں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔۔۔ جب آپ دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ کر لیں گے۔۔۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔۔۔ "ایک انجیکشن میں اسے لگا چکا ہوں۔۔۔" ڈاکٹر بشیر نے ایک انجیکشن بھر کر لگا دیا۔۔۔

اس بار یاسر فوراً ہی گہری نیند میں چلا گیا۔۔۔

ڈاکٹر اشفاق اسے واپس لے آئے۔۔۔ بیگم رو رہی تھیں۔۔۔ ان کے عزیز کی بیگم انہیں تسلی دے رہی تھیں۔۔۔ جوں ہی انہوں نے یاسر کو دیکھا فوراً بڑھ کر بازوؤں میں لے لیا۔۔۔

"کیا بنا۔؟" انہوں نے مختصراً پوچھا۔

"بیگم ابھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا... ویسے میرا دل کہتا ہے کہ جب وہ سیاہ درخت ہو جائے گا تو یاسر بھی ٹھیک ہو جائے گا..." ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔

ان کے دماغ میں دماغی خلیوں سے ملتے جلتے خلیے گھوم رہے تھے جو کہ یاسر کے خون میں دیکھے گئے تھے... اور ڈاکٹر نیازی کی رپورٹ گھوم رہی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ سیاہ درخت کے پتے میں انسانی دماغ جیسے خلیے ملے ہیں۔

☆

اگلے دن ڈاکٹر اشفاق کے گھر کے باہر عجیب سماں تھا... پندرہ کے قریب آدمی ایسے کھڑے تھے وہاں جنہوں نے پلاسٹک کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے.... اور سروں پر ہیلمٹ پہن رکھے تھے...

اور کچھ آدمی بڑے بڑے سلنڈر ایک ٹرک سے اتار رہے تھے۔ وہ لوگ ڈاکٹر نیازی نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا...

"یہ سب کیا ہے...؟" ڈاکٹر اشفاق نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آدمی جو پلاسٹک کا لباس پہنے ہوئے ہیں یہ پائپوں کے ذریعے درخت پر جھاگ یا FOAM پھینکیں گے... اور یہ جو سلنڈر ہیں ان میں وہ جھاگ ہے.... ڈاکٹر نیازی نے انہیں بتایا...

"آپ نے یہ سب انتظام کیسے کر لیا۔؟"

"بہت مشکل سے انتظام ہوا ہے... اور یہ سلنڈر باقاعدہ خریدے گئے ہیں ایک کمپنی سے... وہ بل آپ کو بھیج دیں گے..."

"بل کی کوئی بات نہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا اس طرح یہ درخت ختم ہو جائے گا۔؟" ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا۔

"مجھے پورا یقین ہے۔" ڈاکٹر نیازی کا لہجہ پُرجوش تھا...

"انکل۔! یہ لوگ پلاسٹک کا لباس کیوں پہنے ہوئے ہیں؟" فاطمہ نے اچانک پوچھا۔

"یہ اس لیے کہ کہیں درخت کوئی خطرناک حرکت نہ کرے... تم تو دیکھ چکی ہو کہ درخت نے کس طرح حملہ کیا تھا..."

"جی ہاں!" فاطمہ نے جھرجھری لی... اسے درخت کاٹنے والے پر درخت کا حملہ یاد آ گیا تھا۔

ڈاکٹر اشفاق نے گھر کے گیٹ کا تالا کھول دیا... وہ لوگ سلنڈر لے کر باغ میں رکھنے گئے... یہ کل پانچ سلنڈر تھے...

پھر ہر ایک سلنڈر کے آگے ایک ایک پائپ فِٹ کیا گیا... یہ پائپ دس دس فٹ لمبے تھے... ہر ایک پائپ کو تین تین آدمیوں نے تھام لیا...

اور درخت سے پانچ پانچ فٹ پرے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں...

"کیا ہمیں اجازت ہے...؟" ایک نے ڈاکٹر نیازی سے پوچھا...

"نہیں۔! پہلے ہمیں اندر جا لینے دو... اور تم لوگ سلنڈر آن کر کے فوراً دور ہٹ جانا۔" ڈاکٹر نیازی نے ان پانچ افراد کی طرف مڑ کر کہا جو سلنڈروں کے پاس موجود تھے..

جی بہتر۔!" ان میں سے کئی ایک ساتھ بولے۔ یہ پانچ پلاسٹک کا لباس پہنے ہوئے نہیں تھے...

ڈاکٹر اشفاق، بیگم اشفاق اور بچے... ڈاکٹر نیازی کے ساتھ گھر کے اندر آ گئے... یاسر ابھی تک نیند میں تھا... بیگم اشفاق نے اسے اندر ایک بستر پہ لٹا دیا تھا.. انہوں نے باغ کے ساتھ والے کمرے کی کھڑکیوں میں اپنے لیے جگہ بنالی... باہر کا منظر یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا... یہ وہی کھڑکیاں تھیں جن میں سے فاطمہ نے درخت کو درخت کاٹنے والے پر حملہ کرتے دیکھا تھا...

"ہاں اب تم لوگ اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔" ڈاکٹر نیازی نے اونچی آواز میں کہا۔

انہوں نے پائپوں کے منہ درخت کی طرف کر دیے...

مگر اگلا منظر اتنا حیران کن تھا... کہ سب دم بخود رہ گئے۔

درخت کی شاخیں ہلی تھیں... اور پھر ان شاخوں کے رخ پائپ پکڑنے والوں کی طرف ہو گئے تھے...

پائپ والے اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے...

ایک منٹ کے لیے تو کوئی کچھ نہ بولا مگر پھر ڈاکٹر نیازی نے اس خاموشی کو توڑا۔۔

"تم لوگ اس طرح کیوں کھڑے ہو۔۔۔ یہ ایک عجیب درخت ہے۔ گھبراؤ نہیں اور جھاگ پھینکنی شروع کرو۔۔

وہ سب چونک گئے۔۔۔

پائپ والے پھر الرٹ ہو گئے۔۔۔ سلنڈر پر موجود لوگوں نے سلنڈر آن کر دیے اور خود جلدی سے پرے ہٹ گئے۔۔۔

پائپوں میں سے جھاگ دھاروں کی شکل میں نکلی اور درخت پر پڑی۔۔۔

اسی وقت درخت کی شاخوں سے کانٹے تیر کی طرح نکلے اور پائپ والوں کی طرف بڑھے۔۔۔

"اُف!" ڈاکٹر اشفاق کے منہ سے حیرت سے نکلا تھا۔۔۔

یہ کانٹے پلاسٹک کے لباسوں سے ٹکرا رہے تھے۔۔۔ اچانک اس پلاسٹک کے لباس والوں میں سے ایک آدمی زمین پر گر گیا۔۔۔

لگتا تھا کہ کانٹا اس کے کہیں اثر کر گیا تھا۔۔۔

جھاگ برابر درخت پر گر رہی تھی۔۔۔ کچھ ٹہنیاں تو پوری طرح چھپ گئی تھیں جھاگ میں۔۔

انہوں نے دیکھا کئی جگہ سے جھاگ دھواں بن کر اڑ رہی تھی۔۔۔

"آپ نے دیکھا کہ جھاگ دھواں بن رہی ہے۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔۔۔

"میرا خیال ہے کہ درخت اپنا درجۂ حرارت بڑھا رہا ہے۔ وہ جھاگ کا مقصد سمجھ گیا ہے۔ اور اس گرمی سے یقیناً جھاگ زیادہ دیر ٹِک نہیں سکے گی۔۔" ڈاکٹر نیازی نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔۔۔

"تڑاک۔!" ایک زور آواز آئی۔۔۔

انہوں نے دیکھا درخت کی ایک بڑی شاخ ٹوٹ کر گر رہی تھی۔۔۔

"دیکھا۔! جھاگ کام کر رہی ہے۔۔" ڈاکٹر نیازی کے لہجے میں جوش تھا۔۔۔

"سلنڈروں سے جھاگ نکلنے کی رفتار بڑھاؤ۔ اور تیزی سے جھاگ پھینکو۔۔" ڈاکٹر نیازی چلائے تھے۔۔۔

سلنڈروں والے پانچ آدمی سلنڈروں کی طرف بڑھے۔۔ مگر اسی وقت ان میں سے ایک چیخ مار کر گر گیا۔۔۔ باقی گھبرا کر رک گئے۔۔۔

"رکو نہیں۔۔۔ ورنہ تم بھی اسی طرح شکار ہو جاؤ گے۔۔۔ جلدی سے رفتار بڑھاؤ۔" ڈاکٹر نیازی پھر چیخے۔۔۔

وہ جلدی سے بڑھے۔۔۔ اور سلنڈروں کی رفتار والا نٹ گھما دیا۔۔۔

جھاگ اب اور تیزی سے نکل رہی تھی۔۔۔ زمین سے پانچ چھ فٹ اوپر تک درخت جھاگ میں گم ہو چکا تھا۔۔۔

بہت سی جھاگ دھواں بھی بنتی جا رہی تھی۔۔۔

"تڑاک۔!" ایک اور شاخ ٹوٹ کر گری تھی۔۔۔

اچانک پلاسٹک کے لباس والوں میں سے ایک اور آدمی زمین پر آ رہا۔۔۔

پلاسٹک کے لباس والے بھی گھبرا گئے تھے۔۔۔

"ہمت نہ ہارو۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔۔" ڈاکٹر نیازی بہت زور سے کہہ رہے تھے۔۔۔

اب درخت تین چوتھائی جھاگ میں چھپ چکا تھا۔۔۔

"اوپر بھی جھاگ پھینکو۔۔۔ درخت کے اوپری حصّے پر۔" ڈاکٹر نیازی نے ہدایت دی۔

دو پائپوں کے منہ اوپر کی طرف ہو گئے تھے۔۔۔ تین منٹ اور لگے تھے۔۔۔

سارا درخت جھاگ میں چھُپ گیا تھا۔۔۔

"اسی طرح جھاگ پھینکتے رہو۔۔۔"

"جناب جھاگ ختم ہونے والی ہے۔۔" ان میں سے ایک آدمی نے چلّا کر کہا۔۔۔

"جب تک ہے۔۔۔ پھینکتے رہو۔"

اتنے میں ایک پائپ سے جھاگ نکلنا بند ہو گئی تھی۔۔۔ ایک سلنڈر خالی ہو گیا تھا۔۔۔ باقی چار پائپ اب بھی جھاگ پھینک رہے تھے۔

ڈاکٹر نیازی کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔۔۔ باقی لوگ بھی دم بخود تھے۔۔۔

ڈاکٹر نیازی گھڑی کی طرف بار بار دیکھ رہے تھے۔۔۔

"ایک منٹ گزر چکا ہے... بس اگر دو منٹ اور درخت یوں ہی جھاگ میں چھپا رہا تو..."
ڈاکٹر نیازی نے آہستہ سے کہا...

ڈیڑھ منٹ...

ایک منٹ پینتالیس سیکنڈ...

دو منٹ...!

سب کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے...

ایک اور سلنڈر ختم ہو گیا تھا...

دو منٹ تیس سیکنڈ...

دو سلنڈر اور ختم ہو چکے تھے...

اب صرف ایک رہ گیا تھا...

دو منٹ پینتالیس سیکنڈ۔

آخری سلنڈر بھی ختم ہو گیا...

سب خاموشی سے درخت کی طرف دیکھ رہے تھے... وہ سارا جھاگ میں چھپا ہوا تھا... کئی جگہ سے جھاگ دھواں بن کر اڑ رہی تھی... اچانک تڑاک تڑاک کی کئی زوردار آوازیں آئیں... اور— پورا درخت ٹوٹ پھوٹ کر زمین پر آ رہا...

سب کی جان میں جان آئی۔

"خدا کا شکر ہے—!" بیگم اشفاق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا...

سب لوگ تیزی سے باہر کی طرف لپکے...

"ٹھہریں... باہر ہر طرف اس درخت کے کانٹے بکھرے ہوئے ہیں... جو بہت خطرناک ہیں... ذرا دیکھ کر جائیے گا..." ڈاکٹر نیازی نے انہیں خبردار کیا...

"بچو، تم اپنی امی کے پاس رہو... میں اور تمہارے انکل صرف باہر جائیں گے..." ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔

وہ باہر آئے تو تمام لوگ ان تین افراد پر جھکے ہوئے تھے... جو کہ اس عجیب جنگ کے دوران گر گئے تھے...

"جناب یہ تینوں مر چکے ہیں۔"
ان میں سے ایک نے ڈاکٹر نیازی اور ڈاکٹر اشفاق کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا...
دونوں یہ سن کر ٹھٹھک کر رک گئے تھے...

پولیس آئی تھی... اس نے لاشوں کو اٹھایا تھا... اور ڈاکٹر نیازی اور ڈاکٹر اشفاق کے بیان لیے تھے... کئی اخباری نمائندے بھی آ گئے تھے...

دوپہر کے بعد جا کر کہیں وہ فارغ ہوئے تھے... کھانے کے دوران بھی درخت ہی زیر موضوع تھا...

"اس درخت کے ملبے کو میں تحقیق کے لیے لے جانا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر نیازی نے کہا۔

"ضرور— بھلا اور اس کا کیا کرنا ہے... میں سوچ رہا تھا کہ اس ملبے کو کہاں پھینکوں گا... آپ نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔" ڈاکٹر اشفاق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اموات کا مجھے بہت افسوس ہے... مجھے اور بہتر انتظام کرنا چاہیے تھا..." ڈاکٹر نیازی اچانک افسردہ ہو گئے...

ڈاکٹر اشفاق بھی سنجیدہ ہو گئے تھے...

"ان کانٹوں کا کیا کیا جائے جو پورے باغ میں بکھرے ہوئے ہیں۔" اچانک ڈاکٹر اشفاق نے پوچھا...

"میرے شعبہ سے لوگ آئیں گے... وہ ایک ایک کانٹا چن لیں گے آپ فکر نہ کریں..." ڈاکٹر نیازی نے کہا...

اتنے میں بیگم اشفاق بھاگی بھاگی آئیں۔

"وہ... وہ یاسر جاگ گیا ہے... اور آپ کو بلا رہا ہے..." ان کے لہجے میں خوشی تھی۔

سب جلدی سے یاسر کے کمرے میں گئے... یاسر بستر پر بیٹھا ہوا تھا...

"ابو—!" وہ اپنے والد سے لپٹ گیا...

"ابو میں اس وقت سویا ہوا کیوں تھا... کیا میں بیمار ہوں؟" یاسر نے پوچھا...

"نہیں بیٹے—! تم بالکل ٹھیک ہو۔"

انہیں احساس ہو گیا تھا کہ یاسر نے جو کچھ کیا اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اور یہ اچھی بات تھی...
یاسر کو اس کی امی کے پاس چھوڑ کر وہ ڈاکٹر نیازی کے ساتھ باہر لان میں آ گئے تھے...
"یہ بہت اچھا ہوا کہ یاسر کو کچھ یاد نہیں رہا..." ڈاکٹر اشفاق نے کہا....
"ہاں... واقعی۔ آپ کے خیال میں یاسر کو ہوا کیا تھا...؟" ڈاکٹر نیازی نے پوچھا...
"میرا خیال ہے کہ درخت نے کسی طرح اپنے خلیے یاسر کے جسم میں داخل کر دیے۔ یہ اس وقت ہوا ہو گا جب درخت چھوٹا تھا... اور ہمیں اس کے بارے میں نہیں پتا تھا... یاسر یقیناً کھیلتا ہوا اس درخت کے پاس چلا گیا ہو گا۔ اور بعد میں وہ یاسر کے دماغ کو کنٹرول کرتا رہا۔ اس کے ختم ہوتے ہی یہ کنٹرول ختم ہو گیا۔ اب صرف ایک بار پھر خون ٹیسٹ کروانا ہو گا تاکہ پتا چل سکے کہ وہ خلیے اب تو نہیں ہیں یاسر کے خون میں۔" ڈاکٹر اشفاق نے بتایا...
"اچھا اب دوائیاں مٹی میں نہ دبائیے گا۔" ڈاکٹر نیازی نے ہنستے ہوئے کہا...
"نہیں... یہ اب کبھی نہیں ہو گا..!"

☆

درخت کو ختم ہوئے دو دن گزر چکے تھے... ڈاکٹر نیازی کے عملے کے آدمی درخت کو اٹھا لے گئے تھے... انہوں نے تمام کانٹے بھی چن لیے تھے... بلکہ کانٹے چننے کے بعد پورے باغ میں رولر پھروا دیا تھا تاکہ اگر کوئی کانٹا ہو بھی تو کچلا جائے... پودے بھی سارے نکلوا دیے گئے تھے... اب وہ باغ کم اور کسی کھیت کا ہل چلا ہوا حصہ زیادہ لگتا تھا...
اخباروں میں بھی خوب خبر لگی تھی... کئی عدالتی مسئلے بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے...
ڈاکٹر اشفاق ان دو دنوں سے ہسپتال بھی نہیں گئے تھے... آج بھی وہ گھر ہی تھے...
یاسر کے خون کی رپورٹ آئی تھی... خون میں کوئی خلیہ نہیں تھا... انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا... دوپہر کے وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی... ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور اٹھایا۔
"ہیلو۔!"
مگر اگلا لمحہ ان کے لیے حیران کن تھا...
دوسری طرف سے ان کی اپنی آواز میں ہیلو کہا گیا تھا...
"یہ کیسے ہو سکتا ہے... اب تو درخت بھی نہیں ہے۔" انہوں نے سوچا۔

"کون ہو تم۔؟"
"کون ہو تم۔؟" دوسری طرف سے انہی کی آواز میں کہا گیا...
ڈاکٹر اشفاق نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا... اور باہر لان کی طرف لپکے...
درخت والی جگہ خالی تھی... بجلی اور ٹیلی فون کے تار گزر رہے تھے... اسی جگہ کے اوپر سے۔
"بجلی بھی اب ٹھیک ہو چکی ہے... تو پھر یہ ٹیلی فون؟" وہ پریشان نظر آ رہے تھے...
اچانک ان کی نظر ٹیلی فون کی تار کے ایک حصے پر پڑی...
وہاں پر کوئی چیز تار سے لپٹی ہوئی تھی...
وہ اور قریب گئے... اور غور سے دیکھا... اور پھر ان کے ہوش اڑ گئے... وہ چیز اسی درخت کی ایک چھوٹی سی ٹہنی تھی جو کہ کسی بیل کی طرح تار سے لپٹی ہوئی تھی...
"اف خدایا۔!"
وہ تیزی سے گھر کی طرف مڑے اور سیدھے ٹیلی فون کی طرف بڑھے... جلدی جلدی نمبر گھمائے۔
"ہیلو۔ ڈاکٹر نیازی... فوراً یہاں پہنچیں... میں ڈاکٹر اشفاق ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا...
کچھ دیر بعد ڈاکٹر نیازی بڑی حیرت سے ڈاکٹر اشفاق کی بات سن رہے تھے...
"تو آپ کا خیال ہے وہ ٹہنی ٹیلی فون کر رہی ہے؟"
"جی ہاں! اب اس ٹہنی کا کچھ کریں۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔
"ایک طریقہ ہے کہ ٹیلی فون کی تار کو ٹہنی کے دونوں طرف سے کچھ فاصلے سے کاٹ لیا جائے... اور اسی طرح لیبارٹری پہنچا دیا جائے۔" ڈاکٹر نیازی نے تجویز پیش کی۔
"یہی ٹھیک رہے گا۔"
"مگر آپ ایکسچینج سے پتا تو کریں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ کو تنگ ہی کر رہا ہو۔"
"یہ بھی کر لیتا ہوں... محکمہ ٹیلی فون میں میرا ایک واقف ہے..." ڈاکٹر اشفاق نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا...
قریباً تین گھنٹے میں ان کے فون کی پچھلے ہفتے کی مکمل رپورٹ آ گئی...

" دیکھ لیں آپ بھی۔ ۔ ۔" ڈاکٹر اشفاق نے ڈاکٹر نیازی کی طرف رپورٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔
" اس میں رات کے کسی فون کا ذکر نہیں ہے اور نہ آج کسی فون کے آنے کا۔ ۔ جب کہ میں خود یہ فون سن چکا ہوں۔ ۔ "

" واقعی ۔! اب تو مجھے بھی یقین ہے کہ یہ درخت فون میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ ۔ ۔ ڈاکٹر نیازی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ۔ ۔

" ڈالتا تھا نہیں، اب بھی ہے۔ ۔ ۔ اس ٹہنی کو بھول گئے ہیں کیا؟ ۔"

" ہاں۔ ۔ ۔ مگر اس وقت میرا آدمی پہنچنے ہی والا ہے۔ ۔ ۔ وہ کچھ ہی دیر میں اس ٹہنی کو لیبارٹری لے جائے گا۔ ۔ " ڈاکٹر نیازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔

پھر وہ ٹہنی بھی لے جائی گئی تھی۔ ۔ ۔ اس کے بعد کبھی ایسا فون نہیں آیا۔ ۔ ۔
مگر یہ تھا کہ فون کی گھنٹی جب بھی بجتی تھی سب چونک جاتے تھے۔ ۔ ۔

اب تو انہوں نے نیا مالی رکھ لیا تھا۔ ۔ ۔ وہ باغ کو از سرِ نو ترتیب دے رہا تھا۔ ۔ ۔

" مالی ۔! سیاہ رنگ کا درخت دیکھا ہے کبھی؟" ایک دن بیگم اشفاق نے اس مالی سے پوچھا۔ ۔ ۔

" نہیں بی بی جی! دیکھا تو نہیں، مگر اپنے بزرگوں سے سنا ضرور ہے ۔"

" کیا کہتے ہیں بزرگ تمہارے۔ ۔ ۔ کیا ایسا درخت لگوانا چاہیے ۔ ؟"

" توبہ کریں بی بی جی!" مالی کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔

" کیوں ۔ ؟"

بزرگ کہتے ہیں کہ سیاہ درخت بہت منحوس ہوتا ہے۔ ۔ ۔ گھروں میں ٹھیک نہیں اس کا لگانا" مالی کہہ رہا تھا۔ ۔ ۔

بیگم اشفاق کے ذہن میں پہلے والے مالی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ۔ ۔

" جہاں سیاہ رنگ کا پودا یا درخت اگ آئے وہاں پریشانیاں نازل ہوتی ہیں ۔"

" جو پریشانیاں قسمت میں ہوں وہ تو آتی ہی ہیں۔ ۔ ۔ درخت نے کیا منحوس ہونا ہے ۔ شکر ہے خدا کا کہ پریشانی کا دور گزر گیا۔ ۔ ۔ "

بیگم اشفاق یہ سوچتی ہوئیں گھر کی طرف مُڑ گئی تھیں۔ ☆